Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1963

عقل کی فضیلت

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ام المؤمنین ! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم عبادت کرتا ہے دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے ۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کون زیادہ پسندیدہ ہے ۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک دفعہ ایسا ہی سوال رسول اللہؐ سے کیا تھا تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ان میں سے جو زیادہ عقلمند ہے، وہ ۔ میں نے عرض کیا ۔ یا رسول اللہؐ ! میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا ۔ آپؐ نے فرمایا اے عائشہؓ ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا ۔ پھر جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی دنیا اور آخرت میں افضل ہوگا ۔

(کتاب الاذکیا ۔ ابن جوزی ۔ بحوالہ ادبی دنیا ۔ اکتوبر 1962)

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیغامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر ـــ (۸۰۸۰۰)
پاکستان و ہند سے سالانہ ۸ روپے غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ	پاکستان و ہند سے ۷۵ نئے پیسے	خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

جلد (۱۶) — اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء — نمبر (۱۰)

فہرستِ مضامین

۱- لمعات ـــ (اسلامی مشاورتی کونسل کا سوالنامہ) ـــ ۲

۲- علامہ عنایت اللہ خاں المشرقیؒ ـــ ۱۹

۳- علماء سے پوچھئے ـــ ۲۹

۴- پاکستان کس نے بنایا؟ ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۴۳

۵- حقائق و عبرت ـــ ۵۷
(۱) یہ مذہب نہیں سیاست ہے۔
(۲) ذرا گھر کے اندر جھانکئے۔
(۳) اکثریت کی حکومت۔
(۴) عورتوں کے حقوق۔

۶- باب المراسلات ـــ ۶۵

۷- رابطہ باہمی ـــ ۶۸

۸- تعبیرِ سیرت ـــ (مولانا عبدالرب صاحب) ـــ ۷۱

۹- منصبِ رسالت ـــ (محترم عبدالمجید خاں صاحب) ـــ ۷۴

۱۰- بچوں کا صفحہ ـــ ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اسلامی مشاورتی کونسل کا سوالنامہ

دستور پاکستان (۱۹۶۲ء) کی دفعہ ۱۹۹ کے تحت ایک اسلامی مشاورتی کونسل کا تقرر عمل میں لایا گیا تھا آئین کی دفعہ ۲۰۳ کی رُو سے، کونسل کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ

(i) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے پاس اپنی ایسی سفارشات بھیجے جن کی رُو سے مسلمانانِ پاکستان اس قابل ہو سکیں کہ وہ ہر لحاظ سے اپنی زندگی اسلامی اصولات اور تصورات کے مطابق بسر کر سکیں! اور

(ii) اگر مرکزی یا صوبائی اسمبلی، یا صدر مملکت پاکستان یا کسی صوبے کا گورنر کونسل سے استصواب کرے، تو کونسل مشورہ دے کہ آیا زیر نظر مسودۂ قانون ان اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں، جو قانون سازی کے سلسلہ میں آئین میں مذکور ہیں (ان اصولوں میں پہلا اصول یہ ہے کہ وہ قانون، اسلام کے خلاف نہ ہو)۔

کونسل نے اپنے یوم تقرر سے لے کر اس وقت تک، اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے، اس کے متعلق نہ تو کبھی کونسل کی طرف سے کوئی تفصیلات شائع ہوئی ہیں اور نہ ہی حکومت کی طرف سے، بجز اس کے کہ اخبارات میں شائع شدہ اطلاعات کے مطابق ہر دست تجارتی سود کا مسئلہ زیر غور ہے۔ اور شراب کے متعلق آئندہ غور کیا جائے گا۔ ہمارے ہاں یہ عجیب بات ہے کہ وہ ادارے جن کا تعلق ان امور سے ہے جو ہماری قومی زندگی سے براہ راست متعلق ہیں، اور جن کی کلی یا جزوی کفالت خزانہ عامرہ سے ہوتی ہے، قوم کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ انہوں نے آج تک کیا کیا ہے اور اب کیا کر رہے ہیں، یا اس کے بعد ان کے پیش نظر کیا پروگرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کا لاکھوں روپیہ ان اداروں پر صرف ہو رہا ہے، لیکن جن مقاصد کے لئے یہ وجود

میں آئے ہیں، ان میں سے کسی کا کوئی محسوس نتیجہ قوم کے سامنے نہیں آتا۔

۲- حال ہی میں اسلامی مشاورتی کونسل کی طرف سے مذکورہ بالا شق (۱) کے تحت ایک سوالنامہ شائع ہوا ہے، جس میں قوم سے کہا گیا ہے کہ وہ بتائے کہ ہمارے معاشرہ کی خرابیاں کیا ہیں اور ان کا علاج کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس خیال سے کہ بقول مولانا رومؒ، "کوشش بیہودہ بہ از خفتگی"، یہ سوالنامہ غنیمت ہے کہ اس سے اتنا اندازہ تو ہو گیا کہ ہماری یہ کونسل بقیدِ حیات ہے۔ لیکن جب ہم سوالنامہ کے متن پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اس پر افسوس آتا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ قوم نے اس کونسل کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہ معاشرہ کی خرابیوں کی نشان دہی کرے اور ان کے ازالہ کی تجاویز بتائے، یہ کونسل اُلٹی قوم سے پوچھ رہی ہے کہ بتاؤ تم میں کون کون سی خرابی ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ دوسرے اس لئے کہ سوالنامہ اس قدر سطحی امور پر مشتمل ہے کہ ان سے وہ تمام توقعات خاک میں مل جاتی ہیں جو قوم نے کونسل سے وابستہ کی تھیں۔ سارے سوالنامہ کا ملخص یہ ہے کہ قوم نے اسلامی طرزِ زندگی چھوڑ دیا ہے اور غیر اسلامی شعار اختیار کر لیا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ لوگ شراب پیتے ہیں۔ ریس کھیلتے ہیں۔ شبینہ کلبوں میں جاتے ہیں۔ یا دوسری طرف وہ نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، رمضان المبارک کا احترام نہیں کرتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شراب پینا۔ جوا کھیلنا، اسلامی احکام کی خلاف ورزی ہے اور مسلمانوں کے لئے نماز، روزہ کی پابندی ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر لوگ شراب پینا اور جُوا کھیلنا چھوڑ دیں، اور نماز روزے کے پابند ہو جائیں، تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ اسلامی طرزِ زندگی کے پابند ہو گئے ہیں اور دین کا منشا پورا ہو گیا ہے؟ اگر اسلامی طرزِ زندگی صرف انہی باتوں کا نام ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لئے اس قدر تگ و تاز کے بعد ایک الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اتنا کچھ تو ہندوستان میں رہ کر بھی ہو سکتا تھا۔ ہندوستان میں اب بھی کروڑوں مسلمان ایسے ہوں گے جو شراب نہیں پیتے۔ جُوا نہیں کھیلتے اور نماز روزے کے پابند ہیں۔ یہ باتیں تو (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) ہر "ملّائے مسجد" بھی کہہ سکتا ہے ——— اور کہتا چلا آ رہا ہے۔ قوم کو مشاورتی کونسل سے، اس سے بلند فکری سطح کی توقع تھی۔

۳- حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں گزشتہ سولہ برس سے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے (یا بالفاظِ صحیح، ان لوگوں کی طرف سے جو مذہب کی آڑ میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے درپے ہیں) ایک منظم پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے، جس نے فضا کو بے حد متاثر کر رکھا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ زمامِ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو تعلیم یافتہ ہیں۔ لہٰذا یہی وہ طبقہ ہے جسے یہ (مذہب پرست) طبقہ اپنا حریف سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ اسے آگے چل کر انہی کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ چنانچہ یہ لوگ اس (تعلیم یافتہ) طبقہ میں ہر قسم کے کیڑے ڈالنے کے مقدس جہاد میں مسلسل اور پیہم مصروف ہیں۔ تاکہ عوام کے دل میں ان کی طرف سے نفرت کے جذبات اُبھریں اور وہ اس "دیندار"

طبقہ کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوں، اور اس طرح پولنگ اسٹیشنوں پر "شریعتِ حقہ" کا جھنڈا بلند ہو جائے۔
اس سلسلے میں ان لوگوں کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ یہ اٹھتے بیٹھتے پراپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ

(i) پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں قانونِ شریعت نافذ ہو۔

(ii) یہ مغرب زدہ طبقہ جو اسلام کے نام تک سے واقف نہیں، اور جس کی اپنی ـــ اور ان کی بیگمات کی ـــ زندگی کھلے ہوئے فسق و فجور اور بے حیائی کی زندگی ہے، یہ اسلام کو کیا جانیں؟ ان کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار رہیگی تو یہ یہاں سیکولر (لادینی) حکومت قائم کریں گے۔ یہ کمال اتاترک کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ یہاں فحاشی اور بے حیائی عام ہوگی۔ شراب کے دور چلیں گے۔ جوئے کے اڈے قائم ہوں گے، جگہ جگہ رقص گاہیں کھل جائیں گی۔ ان کی نیم عریاں بیویاں اور کالج زدہ لڑکیاں ہر خاص و عام کو دعوتِ معصیت دیتی پھریں گی۔

(iii) تم شریعت کے مطابق حکومت چاہتے ہو تو زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دو جو شریعت کا علم رکھتے ہیں اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں۔

یہ ہے وہ انتخابی مہم جو یہاں خدا، رسول، اسلام۔ شریعت کے نام سے برسوں سے چلائی جا رہی ہے اور کونسل کا سوالنامہ اس حقیقت کی غازی کر رہا ہے کہ بدقسمتی سے وہ بھی اس پراپیگنڈہ سے متاثر ہو رہی ہے۔

ہم اس مقام پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان واقعی اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں صحیح معنوں میں اسلامی مملکت قائم ہو۔ لیکن اسلامی مملکت نہ تو صرف شراب خانے اور جوئے کے اڈے بند کر دینے سے قائم ہو جاتی ہے اور نہ ہی محض صوم و صلوٰۃ کی پابندی سے۔ اس مملکت میں شراب خانے اور جوئے کے اڈے یقیناً بند ہوں گے اور لوگ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند ہوں گے لیکن یہ کچھ اس معاشرہ کا فطری نتیجہ، لیکن اس کا صرف ایک گوشہ ہوگا جو قرآنی خطوط پر متشکل کیا جائے گا۔ قرآنی معاشرہ کے بغیر نہ کوئی مملکت اسلامی کہلا سکتی ہے نہ شریعتِ حقہ کی پابندی ہو سکتی ہے۔ اس معاشرہ کے قیام کے لئے آپ کو اپنا سیاسی اور معاشی نظام بدلنا ہوگا۔ زندگی کی اقدار بدلنی ہوں گی۔ نگاہوں کا زاویہ بدلنا ہوگا۔ نصب العینِ حیات بدلنا ہوگا۔ مختصر الفاظ میں یوں کہئے کہ آپ کو اپنے مروجہ مذہب کی جگہ، جو دورِ عباسی کی ملوکیت، سرمایہ داری، اور عجمی تصورات کا پیدا کردہ ہے اور جس سے زندگی تعطل و جمود کی برفانی سلوں کے نیچے دب کر بے حس و حرکت ہو چکی ہے ـــ وہ دین لانا ہوگا جسے خدا نے اپنی کتاب میں نازل کیا اور اُسے محمد رسول اللہ والذین معہ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا ـــ اور یہ تبدیلی، بلکہ انقلاب لایا نہیں جا سکتا جب تک آپ نصابِ تعلیم نہ بدلیں اور ملک کے قوانین کو قرآنی حدود کے مطابق وضع نہ کریں۔ اس وقت تو اسلامی اور غیر اسلامی کی تمیز کا معیار یہ ہے کہ جو کچھ ہمارا قدامت پرست طبقہ کرے وہ اسلامی اور جو کچھ اس کے خلاف ہو وہ غیر اسلامی۔ ان کی اچکن اور پاجامہ کرتا اور عمامہ اسلامی، اور کوٹ پتلون غیر اسلامی ـــ یہ اور ان کے بیوی بچے چوڑی دار پاجامہ پہنیں، تو عین مطابق

شریعت، اور اگر کالج کے لڑکے اور لڑکیاں تنگ پتلون یا چھوٹی مُنہری کی شلوار پہن لیں تو قابلِ گردن زدنی۔ یہ اگر دن بھر میں پان میں اتنا تمباکو کھا جائیں جو کئی آدمیوں کو مدہوش کرنے کے لئے کافی ہو تو بالکل جائز لیکن دوسروں کے سگریٹ اور پائپ، فسق و فجور کی علامت۔ یہ کوٹھیوں میں رہیں اور موٹروں میں سفر کریں تو خدمت دین۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ کی کوٹھیاں اور موٹریں عیاشی کی دلیل۔ المختصر

میں جو چُپ بیٹھوں بڑی کہلاؤں ۔۔۔ شیخ چُپ بیٹھے، تو کل ٹھہرے

یہ ہے وہ فضا جو یہاں برسوں سے پیدا کی جا رہی ہے، اور (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ امر موجب صد افسوس ہے کہ) مشاورتی کونسل بھی اس سے متاثر نظر آتی ہے۔ پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ جوں جوں الیکشن کا زمانہ قریب آ رہا ہے ان حضرات کی طرف سے پراپیگنڈے کی مہم تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ بدقسمتی سے کونسل کا سوالنامہ عین اسی فضا میں شائع ہوا اور جو سوالات اس میں درج کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ سطحی طور پر ان کے جوابات، تعلیم یافتہ طبقہ کے خلاف، اور قدامت پرست طبقہ کے حق میں جائیں گے، اس لئے یہ طبقہ اسے اُچھا لیگا کہ دیکھ لیجئے۔ مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے متعلق ملک کی رائے کیا ہے ۔۔۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ کونسل نے یہ سوالنامہ اس مقصد کے لئے شائع کیا ہے۔ ان کی نیت تو نیک ہی ہو گی لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلے گا۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد، ہم سوالنامہ اور اپنی بصیرت کے مطابق، اس کے مختصر جوابات پیش خدمت کرتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ قارئین طلوع اسلام کو معلوم ہو جائے کہ جو سوالات اٹھائے گئے ہیں، قرآن کریم کی رُو سے ان کی پوزیشن کیا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سوالنامہ۔ اور۔ جوابات

(۱) سوال۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں مسلم معاشرہ، اسلامی طرزِ زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

جواب۔ اس سوال کا صحیح جواب اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ پہلے یہ متعین کیا جاتا کہ "اسلامی طرزِ زندگی" کسے کہتے ہیں؟ یہ سب سے بنیادی سوال ہے جس کا جواب دینے سے ہر ایک کترا رہا ہے۔ (منیر کمیٹی کی رپورٹ اس پر شاہد ہے کہ علماء کرام یہ نہیں بتا سکے تھے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں)۔ ہمارے نزدیک اسلامی مشاورتی کونسل کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ متعین کرتی کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ اس کے بعد باقی سوالات کا جواب یا حل آسان ہو جاتا۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ یہاں ہر ایک کا "اسلام" کا تصور اپنا اپنا ہے۔ یہی نہیں کہ مذہب پرست طبقہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے اسلام کے تصور میں فرق ہے۔ خود مذہب پرست طبقہ میں بھی مختلف گروہوں کے نزدیک اسلام کا تصور الگ الگ ہے۔ (مثلاً) ابھی اگلے دنوں، جب جماعت اسلامی کی طرف سے خلافِ کعبہ کی نمائش کے جلوس نکالے گئے تو اس جماعت نے

بڑے فخر سے کہا تھا کہ یہ حقیقت کہ قریب پچاس ساٹھ لاکھ مسلمانوں نے خلاف کی زیارت کی، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے کس قدر وابستگی ہے۔ اس کے برعکس علمائے کرام ہی کی طرف سے یہ آوازیں بھی اُٹھی تھیں کہ یہ نمائش اور جلوس ہی سرے سے غیر اسلامی کاروبار تھا۔ (یا مثلاً) محکمۂ اوقاف کی زیرِ سرکردگی مزاروں پر عُرسوں، قوالیوں اور زائرین کی کثرت سے جو رونق بڑھ رہی ہے اُسے ایک طبقہ اسلامی ترقی کی شہادت قرار دے رہا ہے اور دوسرا طبقہ اسے شرک میں اضافہ کہتا ہے۔

سوالنامہ کے دیگر سوالات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کونسل کے ذہن میں اسلامی طرزِ زندگی سے بُعد کا ثبوت یہ ہے کہ سرکاری اور عام تقریبات میں نشہ آور مشروبات پیش کی جاتی ہیں۔ افطار اور نماز کے اوقات میں میٹنگ وغیرہ مقرر کی جاتی ہیں۔ ماہِ مبارک رمضان میں دوپہر کے کھانے اور چائے کی دعوتیں کی جاتی ہیں۔ یا رقص۔ شبینہ کلب اور ریس کورس وغیرہ کا رواج بڑھ رہا ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس اعداد و شمار ہوں جن سے یہ متعین کیا جا سکے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے مسلمانوں میں کتنے لوگ اس قسم کے کام کرتے تھے اور اب ان کی تعداد کتنی ہے۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اس دوران میں آبادی میں کس قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ پھر یہ بھی کہ ہندوستان میں ہماری آبادی مخلوط تھی اس لئے وہاں یہ چیز اُبھر کر سامنے نہیں آتی تھی کہ یہ کچھ کرنے والے مسلمان کتنے ہیں اور غیر مسلم کتنے۔ یہاں چونکہ (کم و بیش) خالص مسلمانوں کی آبادی ہے اس لئے ان کی تعداد بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پراپیگنڈے کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے جو قدامت پرست طبقے کی طرف سے خاص مقاصد کے ماتحت یہاں مسلسل کیا جا رہا ہے اور جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

جہاں تک صحیح اسلامی طرزِ زندگی کا تعلق ہے قرآن کریم نے اسلام اور کفر — مسلم اور کافر — میں واضح اور متعین خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو شخص اپنے معاملات کے فیصلے کتابِ خداوندی کے مطابق نہیں کرتا۔ سو یہی لوگ کافر ہیں۔

(اس آیت سے ملحقہ آیات میں انہی کو ظالم اور فاسق بھی کہا گیا ہے) اس سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ مسلم کون ہے اور کافر کون۔ دیندار کون ہے اور فاسق کون۔ اسلامی طرزِ زندگی کیا ہے اور غیر اسلامی کیا۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی ایسی چیز نہیں جسے انفرادی طور پر اختیار کیا جا سکے۔ اس کے لئے اسلامی معاشرہ، اسلامی مملکت، اسلامی حکومت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ معاملات کے فیصلے از روئے قانون ہوتے ہیں اور قانون کے لئے مملکت کا وجود لابُدی ہے۔ جس مملکت میں قرآنی قوانین رائج نہ ہوں اس میں اسلامی

طرزِ زندگی بسر کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ شراب نہ پیو۔ جُوا نہ کھیلو۔ زنا نہ کرو وغیرہ، اخلاقی احکام، اسلام تک محدود نہیں۔ یہ تعلیم دُنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ ان کے لئے کسی مذہب کی بھی شرط نہیں۔ لاکھوں لامذہب ایسے ہیں جو ان مکروہات سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسلامی زندگی، کتاب خداوندی کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا نام ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو پاکستان ہی میں مسلم معاشرہ اسلامی طرزِ زندگی سے دور نہیں ہوتا جا رہا؛ ہر ملک کے مسلمانوں کی یہی حالت ہے اور اس حالت کی ابتدا عصرِ حاضر سے نہیں ہوئی؛ اس کی ابتدا اس زمانے سے ہوئی ہے جب مسلمانوں کی حکومتیں غیر قرآنی خطوط پر متشکل ہونے لگیں۔ یہ بات صدیوں پُرانی ہے اور اسی طرح سے چلی آ رہی ہے۔

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا معاشرہ اسلامی طرزِ زندگی سے کس قدر دور ہے، سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ جس چیز کو اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اس میں کتنا عنصر کتابِ خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق ہے اور کتنا غیر قرآنی۔ اس تجزیہ کے بعد، ہو سکتا ہے کہ یہ نظر آئے کہ جو طبقہ اسلامی زندگی بسر کرنے کا سب سے بڑا مدعی ہے وہ اسلام سے سب سے زیادہ دور ہے۔ ہمارا اپنا تجربہ یہ ہے کہ جہاں تک صحیح قرآنی اقدار کا تعلق ہے، ان کی طرف مغربی تعلیم یافتہ طبقے کا ذہنی میلان دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور مذہب پرست طبقہ ان کا زیادہ سے زیادہ مخالف ہوتا جا رہا ہے۔ مخالف تو یہ شروع ہی سے تھا۔ اب یہ مخالفت منظم صورت میں نمایاں طور پر سامنے آ رہی ہے۔

۲۔ **سوال**۔ اگر سوال نمبر ۱ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا آپ کے خیال میں منجملہ دیگر امور کے اس کی حسب ذیل وجوہ بھی ہیں:۔

(الف) تعلیم کے ذریعہ مغربی اقدار کی تبلیغ۔

اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو حسب ذیل اداروں میں سے کون سے ادارے اسلامی اقدار کے علی الرغم مغربی رجحانات کو فروغ دینے کا باعث ہیں؟

(۱) اسکول۔ کالج اور یونیورسٹیاں،

(۲) سینما،

(۳) اخبارات اور رسائل، ڈرامہ

(۴) ریڈیو اور معلومات کے دیگر ذرائع۔

(ب) سرکاری اور عام تقریبات میں اسلامی اصولوں کی صریح خلاف ورزی مثلاً ——

(۱) نشہ آور مشروبات کا پیش کیا جانا۔

(ھ) افطار اور سحری کے اوقات میں میٹنگ وغیرہ مقرر کرنا اور منعقد کرنا۔
(و) ماہ مبارک رمضان میں دوپہر کے کھانے اور چائے کی دعوتیں۔
(ج) ایسی فلموں کا دکھانا جن میں اسلام کے اصولوں کا تمسخر اڑایا جاتا ہو یا ان سے بغاوت کا جذبہ ابھارا جاتا ہو۔
(د) رقص۔
(ہ) شبینہ کلب۔
(و) ریس کورس۔
(ز) مینا بازار اور اس قسم کی دوسری تقریبات۔
(ح) (اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی اور چیز بھی اس قبیل میں آتی ہے تو اس کا ذکر کیجئے)۔

جواب۔ یہ وجوہات، صرف علامات مرض ہیں ــــ اور وہ بھی محض سطحی سی۔ علت مرض اور ہے اور وہ یہ کہ
(۱) ہمارا نصاب تعلیم ایسا غلط ہے کہ اس میں قرآنی نظریات زندگی۔ قرآنی تصورات۔ قرآنی اقدار سامنے لائی ہی نہیں جاتیں ــ اور
(۲) ہمارا معاشرہ (یعنی نظام مملکت) غیر قرآنی خطوط پر متشکل ہے۔
ان خرابیوں کا علاج یہ ہے کہ قرآنی اقدار و تصورات کی اہمیت و افادیت کو تعلیم کے ذریعہ ذہن نشین کرایا جائے اور مملکت کے قوانین قرآن کے مطابق ہوں ــــ مملکت کے قوانین کا دائرہ عدالتوں تک ہی محدود نہیں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ہمارا سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام زندگی، قرآنی اصولوں پر متشکل ہو۔ اس کے سوا ان خرابیوں کا کوئی علاج نہیں۔ چیچک کا علاج، الگ الگ پھوڑوں پر مرہم لگانے سے نہیں ہوتا۔ فساد خون کی اصلاح سے ہوتا ہے۔

۳۔ سوال۔ (الف) آپ کے خیال میں مذہب اور ثقافت میں کیا رشتہ ہے؟
جواب۔ جس طرح ہمارے ہاں اسلام کا لفظ ابھی تک اپنے مفہوم کے اعتبار سے غیر متعین ہے اسی طرح "ثقافت" کا لفظ بھی مشخص معنی نہیں۔ اس سے عام طور پر ادب اور فنون لطیفہ مراد لئے جاتے ہیں۔
اسلام، زندگی کی مستقل اقدار پیش کرتا ہے۔ ان اقدار کو سمجھنے سمجھانے یا اجاگر کرنے کے لئے جو ذریعہ بھی اختیار کیا جائے (بشرطیکہ وہ ذریعہ اسلامی اقدار کے منافی نہ ہو) وہ جائز اور مستحسن ہوگا۔ اس اعتبار سے اسلام اور ثقافت کا تعلق ظاہر ہے۔
(ب) بالخصوص کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسی قوم کے افراد جو شدید احساس کمتری میں مبتلا ہوں، اپنے عقائد اور اقدار پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔

جواب ۔ جس قوم کے افراد شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں وہ اپنے عقائد و اقدار تو ایک طرف، کسی عقیدہ اور قدر پر بھی ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔ ثابت قدم رہنا بھی ایک طرف، وہ کسی عقیدہ اور قدر کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار ہی نہیں کر سکتے۔ وہ (عام زندگی کے دائرہ میں) تقال ۔ اور (مذہبی دائرہ میں) مقلد بن کر رہ جاتے ہیں۔

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ

اہلِ پاکستان کو اپنی ثقافت اور اقدار پر فخر محسوس کرنے کے قابل بنانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

جواب ۔ "اپنی ثقافت" کہہ کر کونسل نے پھر ایک الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ ثقافت نہ اپنی ہوتی ہے نہ غیروں کی۔ یعنی نہ اسلامی ہوتی ہے نہ غیر اسلامی ۔ جس طرح (مثلاً) دولت یا شمشیر یا چھاپے خانہ، نہ اسلامی ہوتا ہے نہ غیر اسلامی۔ یہ چیزیں کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، مقصود بالذات نہیں۔ اگر ثقافت (یا دولت، شمشیر، یا مطبع) سے اسلامی اقدار اجاگر ہوتی ہیں، تو وہ مستحسن قرار پائے گی۔ ورنہ غیر مستحسن۔

اقدار، البتہ اسلامی اور غیر اسلامی ضرور ہوتی ہیں۔ قوم کو اسلامی اقدار پر فخر کرنے کے قابل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں ان اقدار کا صحیح تصور اور ان کی اہمیت جاگزیں کرائی جائے جس سے وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ یہ اقدار فی الواقعہ بے مثل و بے نظیر ہیں، اور دنیا اس وقت جن مشکلات میں گرفتار ہے ان کا حل ان کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔

ج ۔ انگریزی کو مندرجہ ذیل اداروں میں جو فروغ حاصل ہے اس کے اثرات کیا ہیں۔

(۱) ہمارے تعلیمی نظام میں۔

(۲) سرکاری دفتروں میں۔

(۳) تجارت و صنعت میں۔

جواب ۔ جہاں تک تعلیمی نظام کا تعلق ہے، اس کے اثرات بڑے مفید ہیں۔ اگر ہماری درسگاہوں سے انگریزی کو دیس نکالا دے دیا جائے۔ یا اس کی حیثیت بہت کم کر دی جائے ــــ تو ہم اس سائنٹفک ترقی سے یکسر محروم ہو جائیں جو دنیا نے اس وقت تک کی ہے۔ اسے بدقسمتی کہئے یا خوش قسمتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انگریزی زبان نے ایسی پوزیشن حاصل کر لی ہے کہ انسان کی علمی متاع اس کے اندر محفوظ ہو رہی ہے، جو قومیں اپنے ہاں اس کی حیثیت کو کم کر دیں گی وہ اس نسبت سے اس متاع سے محروم رہ جائیں گی۔

جہاں تک دفاتر یا تجارت و صنعت کا تعلق ہے، بین الاقوامی سطح پر تو انگریزی کے فروغ کا بڑا فائدہ ہے اس کے بغیر ہم دنیا سے اپنا سلسلہ قائم ہی نہیں رکھ سکتے۔ البتہ جہاں تک عوام کے ساتھ رابطہ کا تعلق ہے، اس کے لئے یہ چیز نقصان رساں ہے۔ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ انگریزی سے لابلد ہے اور اس کی وجہ سے نظم و نسق اور کاروبار میں بڑی

رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے لئے، ہمیں دفاتر، اور کاروباری دنیا میں دو الگ الگ شعبے مستقل طور پر رکھنے پڑیں گے۔ ایک انگریزی کا ـــــ بین الاقوامی سطح پر روابط قائم رکھنے کے لئے اور دوسرا اپنی زبان کا ـــ داخلی روابط کے لئے۔

(د) اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو اپنی ثقافت اور اپنی زبانوں کو فروغ و تقویت بخشنا چاہیے تو آپ حسبِ ذیل امور میں انگریزی کو کیا مقام دیں گے؟

(i) مشرقی اور مغربی پاکستان میں اظہارِ خیال کا ذریعہ۔

(ii) بین الاقوامی سطح پر اظہارِ خیال کا ذریعہ۔

ہم ایک بار پھر اس غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس میں کونسل مبتلا نظر آتی ہے کہ اس وقت پاکستان کا اپنا کوئی کلچر (ثقافت) نہیں۔ جو ادب یا فنِ لطیف اسلامی اقدار کے اجاگر کرنے کا ذریعہ ہوگا، وہ پاکستان کا کلچر ہو جائے گا۔

باقی رہا زبان کا مسئلہ، سو بین الاقوامی سطح پر انگریزی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ رکھنا ناگزیر ہوگا۔ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔

جہاں تک مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اظہارِ خیال کے ذریعہ کا تعلق ہے، اس باب میں ہم نے اپنے لئے عجیب مشکلات پیدا کر رکھی ہیں۔ اگر ہم پاکستان کی ایک ہی قومی زبان تجویز کر لیتے (جو لامحالہ اردو ہوتی) تو صرف مشرقی پاکستان میں اردو کی تعلیم رائج کرنی پڑتی اور اس طرح مشرقی اور مغربی پاکستان میں اظہارِ خیال کا مشترک ذریعہ وجود میں آجاتا۔ لیکن ہم نے جو دو زبانوں کو قومی زبانیں قرار دے لیا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں بنگالی پڑھائی جائے اور مشرقی پاکستان میں اردو۔ اس طرح، پاکستان کے ان دو حصوں میں دو زبانیں اظہارِ خیال کا ذریعہ ہوں گی۔ یہ صورتِ حال جس قدر اطمینان بخش ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک ایسا نہ ہو جائے، مشترک ذریعہ اظہارِ خیال بہرحال انگریزی ہی رہے گی۔

سوال (۱۷)۔ کیا آپ زبان کو فکر و خیال کا ذریعہ محض سمجھتے ہیں یا آپ کا خیال یہ ہے کہ اس کا عمیق اثر فکر و عمل پر مرتب ہوتا ہے۔

جواب ۔ زبان، بنیادی طور پر تو صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ ہوتی ہے، اس لئے جس قسم کے خیالات کی کوئی زبان مظہر ہو گی، اسی قسم کے اثرات فکر و عمل پر مرتب ہوں گے۔ لیکن رفتہ رفتہ، زبان کے بعض الفاظ، خاص تصورات (CONCEPTS) کے پیکر بن جاتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کا اثر دور رس ہوتا ہے (مثلاً) انگریزی زبان میں نبی کے لئے (PROPHET) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ نبوت کے متعلق یہودی تصور کا مظہر ہے۔ جس سے مراد "پیش گوئیاں کرنے والا" تھا۔ (یہودیوں کے ہیکل میں یہ ایک جداگانہ منصب تھا) لیکن قرآن میں

نبوت کا تصور اس سے مختلف ہے۔ اگر ہم انگریزی پڑھتے یا پڑھاتے وقت اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھیں گے تو اس سے قرآنی نبی کے متعلق بھی وہی تصور ذہن میں قائم ہو جائے گا جو یہودی نبی کا تھا۔ اسی طرح خود اُردو میں قرآن کریم کے اکثر الفاظ ان معانی میں مستعمل ہوتے ہیں جو قرآنی تصور کے خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری عام مذہبی کتابوں کی رُو سے جس اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے وہ حقیقی اسلام سے مختلف ہوتا ہے۔ یوں زبان، فکر و عمل پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔

سوال (۵) پاکستان میں انگریزی کو اس وقت جو مصنوعی تفوق حاصل ہے اسے زائل کرنے کے لئے آپ کن تدابیر کی سفارش کرتے ہیں۔

جواب۔ اگر ہم نے پاکستان میں انگریزی زبان کی اہمیت کو کم کر دیا تو یہ اتنی بڑی غلطی ہوگی جس سے پیدا شدہ نقصان کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان کے خلاف تعصب، بلکہ نفرت کا جذبہ بھی ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کا پیدا کردہ ہے۔ یہ خود انگریزی زبان سے ناآشنا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں ایک شدید احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی زبان سے انتقام، اسی جذبۂ کمتری کا نفسیاتی ردِ عمل ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر ہم سرسیدؒ کے وقت، ان حضرات کے فتاویٰ کا اثر قبول کر لیتے اور انگریزی زبان کو لحم خنزیر کی طرح اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے، تو آج ہمارا حشر کیا ہوتا! ہم جو آج (مثلاً) افغانستان اور ایران وغیرہ سے آگے نظر آرہے ہیں، تو اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنے ہاں انگریزی زبان کو رائج کر لیا جس کی وجہ سے ہم نوعِ انسانی کی عالمگیر علمی متاع کے حصہ دار ہو گئے۔

یاد رکھئے قرآن کریم نے اختلاف السنہ کو من آیات اللہ (خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی) قرار دیا ہے۔ اس لئے زبان کوئی بھی ایسی نہیں جسے قابلِ نفرت سمجھا جائے۔ ہمارے لئے عربی زبان کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ قرآن کریم کی زبان ہے جو ہماری زندگی کا ضابطہ ہے۔ اس کے بعد ہر زبان کی اہمیت اس کی افادیت کی نسبت سے ہوگی۔ اور آج انگریزی زبان کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ انگریزی کا تفوق مصنوعی نہیں۔ اس نے اسے (ON MERIT) حاصل کیا ہے۔

سوال (۶)۔ کیا آپ کے خیال میں غیر ملکی مسیحی تبلیغ کے ادارے اسلام سے بے اعتنائی یا اسلام سے مخالفت کا جذبہ پیدا کرنے کا کس حد تک حسبِ ذیل ذرائع سے باعث بنے؟

(ا) مذہبی تبلیغ کا کام،

(ب) تعلیمی ادارے،

(ج) ہسپتال،

(د) فلاح عامہ کا کام،

(د) تجارتی کاروبار

جواب۔ (الف) ۔ مسیحی تبلیغ کے ادارے، مذہبی تبلیغ کے ذریعہ، اسلام سے بے اعتنائی یا اسلام سے مخالفت کا جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تعلیم یافتہ طبقہ عیسائیت کی تعلیم کو علی وجہ البصیرت قبول کر ہی نہیں سکتا۔ وہ تعلیم نہ علم کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہے نہ عقل کو اپیل کرتی ہے۔ یہ طبقہ، اسلام سے بیگانہ، (بلکہ بعض حالات میں متنفر) مسیحی اداروں کی تبلیغ کی وجہ سے نہیں ہو رہا بلکہ اس تعلیم کی وجہ سے ہو رہا ہے جو ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کی طرف سے اسلام کے نام سے پیش کی جاتی ہے۔ پاکستان میں چونکہ (تقسیم سے پہلے وقتوں کے مقابلہ میں) اس قسم کا اسلام زیادہ شدت سے پھیلایا جا رہا ہے، اس لئے اسی نسبت سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ، اسلام سے دور، بلکہ متنفر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

(ب) تعلیمی ادارے ۔ مسیحی تعلیمی ادارے، عیسائیت پھیلانے کے لئے اتنا کام نہیں کر رہے جتنا کام اہل پاکستان کو پاکستان کے تصور سے دور لے جانے کے لئے کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں مستقلاً یہ اثر پیدا کیا جاتا ہے کہ ملک کی تقسیم حماقت تھی۔ پاکستان کی تمام مصیبتوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ ہندوستان سے علیحدہ ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس مسلسل اثر اندازی کا نتیجہ جس قدر تباہ کن ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔

(ج) ہسپتال۔

جواب ۔ ہسپتالوں کے ذریعے عیسائیت تو نہیں، لیکن خود عیسائی، وہاں جانے والوں کی نظروں میں ضرور واجب الاحترام بن جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ وہ سلوک ہے جو ہمارے اپنے ہسپتالوں میں مریضوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ان ہسپتالوں میں مریض، اپنے آپ کو یوں سمجھتا ہے جیسے وہ بوچڑ خانے میں داخل دیا گیا ہو۔

(د) ۔ فلاح عامہ کے کام } جواب ۔ ان ذرائع سے ہمارے نچلے طبقہ میں عیسائیت ضرور پھیل رہی ہے۔
(ہ) ۔ تجارتی کاروبار } یہ مذہبی نہیں بلکہ خالصتہً معاشی مسئلہ ہے جب تک ہم پاکستان میں قرآن کریم کا تجویز کردہ معاشی نظام رائج نہیں کرتے، ان چیزوں کی روک تھام نہیں ہو سکتی۔

سوال (۵) ۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ امر کہ غیر ممالک کو پاکستان میں، امتحانات منعقد کرنے کی اجازت ہے، غیر ملکی اقدار کو فروغ دینے اور نتیجۃً اسلام کی پیروی کے جذبے کو کمزور کرنے کا باعث ہے؟

جواب ۔ سوال کچھ واضح نہیں۔ "امتحانات" سے غالباً وہ امتحان مراد ہیں جو اگر یہاں نہ دئے جائیں تو ان کے لئے طلبا کو بیرونی ممالک میں جانا پڑے۔ اگر مطلب یہی ہے تو ایسے امتحانات کو زیادہ سے زیادہ اسی جگہ منعقد ہونا چاہیئے تاکہ اس غریب ملک کے طالب علم اس قدر اخراجات (اور ملک زرمبادلہ) کے بوجھ سے بچ جائیں۔

اس مقام پر ہم پھر اس حقیقت کو دہرانا چاہتے ہیں کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ، غیروں کے اثرات کے سبب، اسلام سے دور نہیں ہٹ رہا۔ اس کی وجہ وہ اسلام ہے جو ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اور جسے حقیقی

اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ نوجوان طالب علموں کے ذہن میں صحیح قرآنی اقدار کو جاگزیں کیجئے اور پھر انہیں جہاں جی چاہے چھوڑ دیجئے اور دیکھئے کہ کیا یہ دوسروں کی اقدار سے متاثر ہوتے ہیں یا دوسروں کو اپنی اقدار سے متاثر کرتے ہیں۔ چور خود ہمارے اپنے گھر کے اندر ہے اور ہم خواہ مخواہ لوٹے گھما گھما کر چور کا سراغ لگا رہے ہیں اور دوسروں کو مفت میں بدنام کر رہے ہیں۔

سوال (۶) الف۔ پاکستان کے بعد سے شراب کے استعمال میں جو بے پایاں اضافہ ہوا ہے اس کی وجوہات آپ کی رائے میں کیا ہیں؟

جواب۔ اگر واقعی اضافہ ہوا ہے تو اس کی بین وجہ، اوپر کے طبقے میں دولت کی فراوانی ہے جو ہمارے غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہے۔

سوال (۶) (ب) کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ

(۱) ریسٹورنٹوں،

(۲) بار (شراب خانوں)

(۳) ہوٹلوں،

(۴) دوکانوں، اور

(۵) پی آئی اے کے ہوائی جہازوں میں الکحل برسرِ عام رکھا جائے اور فروخت کیا جائے؟

(ج) کیا آپ اس عمل کو مناسب سمجھتے ہیں کہ ہمارے سفارتخانوں میں جو غیر ممالک میں قائم ہیں سرکاری تقریبات کے موقع پر شراب پیش کی جائے؟

جواب۔ خدا کی شان! ہمیں یہ دن بھی دیکھنے تھے کہ اسلامی مشاورتی کونسل کو خود مسلمانوں سے پوچھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ شراب کو بند کیا جائے یا کھلے بندوں عام کر دیا جائے۔۔۔ اس شراب کو جسے خدا کی کتاب بالفاظِ صریح شیطانی عمل قرار دے کر ممنوع ٹھیراتی ہے۔

سوال (۷)۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہماری مساجد مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں وہی حصہ لے رہی ہیں جو ان کو لینا چاہیئے۔ ان سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے آپ کیا تدابیر تجویز کرتے ہیں؟

جواب۔ اس وقت ہماری مساجد صرف "پرستش گاہیں" ہیں، جن میں "دنیا داری" کی باتیں کرنا ممنوع ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ان مساجد کے حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نتیجہ ہے دین کو دنیا سے الگ کر دینے کا۔ جب تک یہ ثنویت (DUALITY) ختم نہیں ہوتی مساجد پرستش کے سوا، کوئی اور کام نہیں لیا جا سکتا۔ عہدِ رسالت مآب اور خلافتِ راشدہ میں جب دین اور دنیا میں جدائی نہیں ہوئی تھی،

مسجد، ملت کی تمام اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز تھی جہاں ان کی کلب بھی تھی جس میں عیاشیوں کا ناچ اور تماشا بھی ہوتا تھا۔

ان سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے "عبادت" کے موجودہ تصور کو بدلنا ہوگا۔

سوال (۸) اس کی کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں تبلیغ اسلام کا جذبہ ٹھنڈا ہے۔ کیا آپ اس جذبہ کو بیدار کرنے کی تجویز کر سکتے ہیں؟

جواب۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

(i) تبلیغ اسلام کا کام مذہبی پیشوائیت نے اپنی اجارہ داری سمجھ رکھا ہے۔ اگر کوئی شخص جو ان کے حلقہ سے متعلق نہیں، اسلام کا نام تک زبان پر لے آئے تو ان کی طرف سے دہائی مچادی جاتی ہے کہ اس نے اسلام کو بھرشٹ کر دیا ہے۔

(ii) خود اس طبقہ کے نزدیک دین، معاش کا ذریعہ ہے۔ (یہ کوئی اور کام جانتے ہی نہیں) اور معاش کے لئے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ کم از کم محنت سے زیادہ سے زیادہ حاصل ہو جائے۔ اب اگر کسی شخص کو دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھانے سے آرام سے روٹی مل جائے، اور ایک ایک وعظ کے ہزاروں روپے نذرانے کے آجائیں، تو وہ دین کی تبلیغ کی خاطر مشقتیں کیوں اٹھائے۔ قرآن کریم نے اسی لئے اس طبقہ کو "مترفین" کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ یعنی وہ سہل انگار لوگ جو دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں۔

اسلام کی تبلیغ، اسلامی نظام کے درخشندہ نتائج کی رو سے ہوتی ہے۔ افراد میں یہ نتائج ان کی سیرت و کردار کی بلندی کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اور اجتماعی زندگی میں، اسلام کے صحیح سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کی صورت میں۔ اس نظام میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوتا۔ دین کی تعلیم عام ہوتی ہے اور ہر مسلمان اس کا مبلغ۔

سوال (۹) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے باہمی مناقشات کی وجہ سے اسلام کا اثر و غلبہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو احیائے اسلام کے مشترکہ مقصد سے آپ باہمی تعاون عمل کس طرح پیدا کر سکتے ہیں؟

جواب۔ آپ "اسلام کے اثر و غلبہ کے کم ہو جانے" کا کہتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے فرقوں کی موجودگی میں سرے سے اسلام ہی باقی نہیں رہتا۔ قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ جو لوگ فرقوں میں بٹ جائیں، آپ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا جب تک فرقے باقی ہیں، اسلام کا احیاء ہو نہیں سکتا۔ اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اب فرقوں کا مٹنا ناممکن ہے تو پھر اسے اسلام کے احیاء کا خیال بھی دل سے نکال دینا چاہیئے۔

سوال (۱۰) علماء کو تربیت دینے کے سلسلے میں آپ کیا اصلاحات تجویز کرتے ہیں؟

جواب۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں "مذہبی علماء" کا الگ تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں "دین اور دنیا" کی تعلیم الگ الگ نہیں ہوتی۔ اس میں ایک سائنٹسٹ دین کا عالم بھی ہوتا ہے۔ دین کے عالم سے مراد فقہ جاننے والا

نہیں۔ اس سے مراد ہے اسلام کے صحیح تصورات، نظریات اور اقدار کا علم رکھنے والا۔

جہاں تک فقہ (LAW) کا تعلق ہے، اس کی تعلیم (LAW COLLEGES) میں دی جائے گی اور اس کے بعد اس شعبہ کے ماہرین کا مقام حکومت کے شعبۂ قانون (LEGISLATIVE DEPARTMENT) میں ہوگا۔

سوال (۱۱) (الف)۔ کیا آپ کی رائے ہے کہ ائمہ اور مبلغین کی تربیت کے لئے کالج قائم کئے جائیں؟

(ب)۔ اگر سوال نمبر ۱۱ (الف) کا جواب اثبات میں ہے تو آپ کی رائے میں ان کو کن مضامین کی تعلیم دی جائے؟

اس کا جواب سوالات (۸) و (۱۰) کے جوابات میں آچکا ہے۔ اسلام کے صحیح نظام میں، ہر تعلیم یافتہ، نماز میں امام بھی ہوتا ہے اور اسلام کا مبلغ بھی۔ علماء۔ ائمہ اور مبلغین کا ــــ عام افراد امت سے الگ وجود، اسلامی نظریہ نہیں۔ اسلام میں پروہتی (PRIEST CRAFT) کا تصور ہی نہیں۔

سوال (۱۲)۔ کیا آپ کی رائے ہے کہ مساجد کے بہتر انتظام، بہتر تعلیم اور اسلامی اصولوں کی بہتر تبلیغ کی غرض سے کوئی باختیار ادارہ قائم کیا جائے۔

جواب۔ جب تک "مسجد" کا صحیح تصور اور مقصد متعین نہیں کیا جاتا، ان کے بہتر انتظام سے، اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح، محض نماز پڑھانے کیلئے ایک الگ امام کا تصور غیر اسلامی ہے۔ اسی طرح محض نماز پڑھنے کے لئے ایک الگ عمارت کا تصور بھی اسلامی نہیں۔

سوال۔ (۱۳) پاکستان میں اسلام کے اثر و نفوذ کو کمیونزم یا ہیومنزم (ان مادی اقدار پر عقیدہ جن کو انسانیت کی تربیت کے لئے مذاہب سے بالاتر سمجھا جاتا ہے) کی وجہ سے کس حد تک نقصان پہنچ رہا ہے؟ ان اثرات کو زائل کرنے کے لئے آپ کیا تدابیر تجویز کرتے ہیں؟

جواب۔ پاکستان میں ہیومنزم کا تو کوئی خاص چرچا نہیں ــــ خود سوالنامہ میں ہیومنزم کی جو تشریح کی گئی ہے وہ اس کی سرسری اور ادھوری سی تعریف ہے ــــ البتہ کمیونزم کا اثر ضرور پایا جاتا ہے۔ اس کا فلسفہ، اسلام کی واقعی نقیض ہے لہٰذا نقصان رساں۔ مسلمانوں کے ممالک میں کمیونزم کا اثر و نفوذ اس غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہے جو عہد عباسیہ میں پیدا ہوا اور جسے بدقسمتی سے ہمارا مذہب پرست طبقہ، عین اسلامی نظام قرار دیتا ہے۔ بنابریں پاکستان میں کمیونزم کے تصور کو پھیلانے کا ذمہ دار ہمارا مذہبی قدامت پرست طبقہ ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں صحیح قرآنی نظام معاشی رائج کیا جائے۔

سوال (۱۴) مندرجہ ذیل مراحل پر اسلامی ادب کی تخلیق کے لئے آپ کیا تدابیر تجویز کرتے ہیں؟

(الف) عوامی سطح پر۔

(ب) اسکولوں اور کالجوں میں، اور

(ج) دانشور طبقہ کے لئے۔

جواب ۔ "اسلامی ادب" کی اصطلاح آج کل ایک خاص مفہوم کے لئے استعمال کی جا رہی ہے ۔۔ اس سے مراد ہے وہ لٹریچر جو یہاں ایک خاص گروہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے ۔۔۔ اگر اسلامی ادب سے مراد ہے ایسا لٹریچر جو قرآنی اقدار کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہو، اس کے لئے پہلے ہمیں اسکولوں اور کالجوں میں صحیح قرآنی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے ۔۔۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کا الگ پیریڈ ہونا چاہیئے۔ اس سے تو اور خرابی پھیل رہی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ طالب العلم میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے کہ جو کچھ وہ پڑھے یا جو معاملہ اس کے سامنے آئے، اس کے متعلق وہ فیصلہ کر سکے کہ اسلام کے میزان میں اس کا وزن کیا ہے۔ جب اس قسم کا تعلیم یافتہ طبقہ، قلم ہاتھ میں لے گا تو اس سے صحیح اسلامی لٹریچر وجود میں آئے گا۔ اس کے بعد اس لٹریچر کی تقسیم مختلف طریق میں کی جا سکتی ہے۔

سوال (۱۵) مندرجہ بالا امور کے علاوہ کیا کچھ اور برائیاں بھی ہیں جو پاکستان کے مسلم معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی ہیں یا کیا آپ کے ذہن میں کچھ اور ایسی تجاویز ہیں جو عملی صورت میں معاشرہ کی اصلاح و ترقی کا باعث بن سکیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو براہ کرم ان برائیوں کی نشاندہی کیجئے اور ان تجاویز کی تفصیلات بیان کیجئے۔

جواب ۔ حیرت ہے کہ مشاورتی کونسل کی نگاہ انہی برائیوں تک پہنچ کر رہ گئی جو محض سطحی اور سرسری ہیں۔ اصلی اور بنیادی خرابیوں تک ان کی نگاہ پہنچی ہی نہیں۔ ہماری اصلی اور بنیادی خرابی ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم یہاں سولہ برس سے مسلسل اور متواتر اسلام۔ اسلام پکارتے چلے آ رہے ہیں لیکن آج تک متعین ہی نہیں کر پائے کہ اسلام کہتے کسے ہیں۔ وہ ہے کیا۔ جب یہ متعین ہو جائے گا کہ اسلام ہے کیا، تو پھر یہ بھی طے ہو جائے گا کہ اسلام کا سیاسی۔ معاشرتی۔ معاشی نظام کیا ہے۔ جب تک ہم اپنے موجودہ نظامِ زندگی کو ۔۔۔ جس میں یہ تمام گوشے شامل ہیں ۔۔۔ اسلامی نظام سے نہیں بدلتے، ہماری کسی خرابی کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

اور یہ متعین کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ خدا نے کفر اور اسلام میں ایسا واضح اور بیّن خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے جس کی موجودگی میں اس باب میں نہ کوئی ابہام پیدا ہو سکتا ہے نہ التباس۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ اس نے بہ صراحت کہہ دیا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ تو یہی لوگ کافر ہیں۔

بات صاف ہے۔ خدا کی کتاب کے مطابق نظامِ زندگی قائم کرنے والے مسلم۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر۔ اس لئے

اس لئے خود نبی اکرمؐ سے کہا کہ وہ اعلان فرما دیں کہ

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۴)

کیا میں معاملات کے فیصلہ کے لئے، خدا کے علاوہ کسی اور کو حکم تلاش کروں۔ حالانکہ اس نے تمہارے لئے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو واضح طور پر نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔

اس کے بعد اس کتاب کے متعلق کہہ دیا کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا - لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ .... (۶/۱۱۴)

تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اسے کوئی بدلنے والا نہیں۔

بات صاف ہو گئی کہ

(۱) مسلم وہ ہے جو اپنے تمام معاملات کے فیصلوں میں خدا کو اپنا حکم مانتا ہے اور اس کے سوا کسی اور کو حکم نہیں مانتا خواہ وہ کیسے باشد۔

(۲) خدا کو حکم بنانے سے مطلب یہ ہے کہ ہر فیصلہ اس کی کتاب کی رو سے کیا جائے۔

(۳) وہ کتاب ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔ اور سمجھنے کے لئے آسان ہے۔

(۴) ہر طرح سے مکمل ہے۔

(۵) غیر متبدل ہے۔

(۶) محفوظ ہے (اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے)

جو مملکت اس کا اعلان کرے کہ وہ اپنے تمام معاملات کے فیصلوں کے لئے خدا کی کتاب (قرآن کریم) کو اپنا حکم مانے گی ـــ اور اس کے علاوہ کسی اور کو حکم نہیں تسلیم کرے گی۔ وہ اسلامی مملکت ہو جاتی ہے اور اس کا نظام، اسلامی نظام ـــ

جب تک ایسا نظام قائم نہیں ہوتا، ہماری خرابیوں کا ازالہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے کرنے کا کام ـــ جسے خدا اس کی ہمت دے۔ باقی سب اپنا اپنا وقت گزارنے کے دھندے ہیں۔

طلوع اسلام کے پرانے پرچے

اگر کوئی صاحب طلوع اسلام کے دور اول (۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۲ء) کے پرچے یا فائلیں فروخت کرنا چاہیں تو ادارہ طلوع اسلام کے پتہ پر تفصیلاً اطلاع دیں۔

پٹ سن کی مصنوعات تیار کرنے والوں میں

★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ
ڈھاکہ

اس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے۔ بوریاں۔ سوتلیاں اور ٹاٹ کی دیگر اشیاء وکینواس دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جاتے ہیں، اور دنیا کے ہر حصے میں ویسے ہی مقبولِ عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

مینجنگ ایجنٹس:-

احمد برادرز لمیٹڈ — ۳۵ — ۳۶ جناح ایونیو۔

رمنا۔ ڈھاکہ (۲)

تار کا پتہ:- "باوانی" ——— فون نمبر ۲ - ۶۷۳۱

کراچی آفس ——— بینک ہاؤس حبیب اسکوائر بندر روڈ کراچی

علامہ عنایت اللہ خان المشرقیؒ

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی!

لاہور کے گلی کوچوں نے ہزاروں جنازے گزرتے دیکھے ہیں لیکن گزشتہ ۲۹ اگست کی صبح کو ان گزرگاہوں سے جو میت گزری وہ اپنے فوجی اسٹائل کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔ یہ خاکسار تحریک کے امیر علامہ عنایت اللہ خان المشرقی (مرحوم و مغفور) کا جنازہ تھا جو ۲۷ اگست کی شب کو ایک طویل علالت کے بعد البرٹ وکٹر اسپتال میں وفات پا گئے۔

اس سانحۂ رحلت نے ملت اسلامیہ کو ایک شہرۂ آفاق اسکالر، ایک جلیل القدر عالم دین، اور ایک عظیم المرتبت صاحب تنظیم سے محروم کر دیا۔ یوں تو ہر قلب حساس نے اس المیہ کو شدت سے محسوس کیا لیکن جہاں تک علامہ مرحوم کے جاں نثار خاکساروں کا تعلق ہے ان پر تو ایک قیامت سی گزر گئی۔ خون کے آنسو روتے ہوئے وہ ہزاروں کی تعداد میں لاہور پہنچ گئے اور انہوں نے جس سپاہیانہ نظم و ضبط اور عسکری جاہ و جلال سے اپنے محبوب امیر کا جنازہ اٹھایا اس سے ان کی عظیم "عسکری تحریک" کی بھولی بسری روایات ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ جنازے کی گاڑی پر لہراتے ہوئے سرخ ہلالی پرچم کے دیش ایک میل تک اس کے پیچھے پیچھے دل گرفتہ اور زخم خوردہ "خاکساروں" کی منظم قطاریں، طویل گزرگاہوں میں مکانوں کی چھتوں پر مردوں، عورتوں اور بچوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ۔ قدم قدم پر پھولوں کی بارش، اور ٹھنڈے پانی کی سبیلیں یہ سب کچھ ایک اثر آفرین کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ شاہی مسجد میں نماز جنازہ کا اجتماع ایک تاریخی اجتماع تھا۔ اور اس کے بعد جب اشکوں کی روانی اور گولوں کی گھن گرج میں ایک "عسکری تحریک" کے بانی کو سپرد خاک کیا جا رہا تھا تو صاف نظر آ رہا تھا کہ عسکریت کی روح اور جذبہ جہاد کے ولولوں سے آج بھی ہمارے ملی شعور نے بیگانگی اختیار نہیں کی۔

جہاں تک علامہ المشرقی مرحوم اور غیر منقسم ہندوستان میں ان کی خاکسار تحریک کے ساتھ وابستہ امیدوں کا

تعلق ہے طلوعِ اسلام نے انہیں ہمیشہ قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا اور دل کھول کر پُرخلوص خراجِ تحسین پیش کیا ہے — طلوعِ اسلام کے سالہا سال کے فائل اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں — اور جب تک وہ ملت کی امیدوں کے مرکز اور امنگوں کے محور رہے، ہماری بھرپور تائید و حمایت ان کے لئے وقف رہی۔ ارباب اقتدار کا استبداد ہو یا مذہبی پیشوائیت کی کافرگری کے ناروا حملے، طلوعِ اسلام بے خوف و خطر ان مجاہدوں کی حمایت میں پیش پیش رہا۔ اور پوری جرأت سے ان کی مدافعت کا حق ادا کرتا رہا۔ یہ سب کچھ کسی رسمی تعلق یا مصلحت کی خاطر ہرگز نہ تھا، بلکہ ان بلند مقاصد کا تقاضا تھا جو ہماری زندگی کا مقصود و منتہیٰ چلے آ رہے ہیں، جب تک علامہ مرحوم اور ان کے خاکسار سپاہی ان مقاصد کے جیتے جاگتے پیکر بن کر کارگہِ حیات میں سرگرمِ تگ و تاز رہے، ہماری مخلصانہ تائید و رفاقت بھی ان کے شاملِ حال رہی۔ اور آج جب کہ پوری ملت علامہ مرحوم کے غم میں سوگوار ہے، ہماری آنکھیں بھی اشکبار ہیں۔

مرحوم خاکسار رہنما کی وفات پر جب ایسوشی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے نمائندے نے محترم پرویز صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ان کے "تاثرات معلوم کرنے کی خواہش کی تو مفکرِ قرآن نے اس سانحۂ غم پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> علامہ صاحب مرحوم و مغفور کی عالمی شہرت کا آغاز ایک "تذکرہ نگار" کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک عظیم فوجی تحریک کے بانی اور قائد کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے۔ یہ سب کچھ ان کی عظمت کی شہادت دے رہا ہے۔ لیکن تذکرہ کے مصنف کی حیثیت سے وہ جس اعزاز کے مستحق تھے وہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ علومِ عصرِ حاضر کی روشنی میں قرآنی حقائق کو پیش کرنے کی یہ بڑی کامیاب کوشش تھی۔ اے کاش! کہ موت علامہ مرحوم کو اس قدر مہلت عطا کرتی کہ وہ تذکرہ کی بقیہ جلدوں کی اشاعت کے قابل ہو سکتے۔
>
> میں جہاں علامہ مرحوم کے لئے بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہوں وہاں مرحوم کے پسماندگان اور متبعین سے بھی دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہوں۔

مندرجہ الفاظ میں مفکرِ قرآن نے علامہ المشرقی مرحوم کی شخصیت پر جو مختصر لیکن انتہائی جامع تبصرہ فرمایا ہے وہ ادارہ طلوعِ اسلام کے تاثرات کی حرفاً حرفاً ترجمانی کر رہا ہے۔ اس لئے کہ خاکسار تحریک کے بانی اور ایک زعیمِ ملت کی حیثیت سے علامہ موصوف نے تاریخ کے صفحات پر جو نقوش چھوڑے تھے انہیں رفتہ رفتہ حوادثِ زمانہ نے محو کر ڈالا۔ اس برصغیر کی سیاسیات نے سنہ ۱۹۴۰ء میں جو رخ اختیار کیا اس نے مرحوم کی زندگی میں ہی ان کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ جس تحریک کے ابھرتے ہوئے عروج و اقبال اور جاہ و جلال سے اس برصغیر کے طول و عرض میں جھٹکے

بر پا ہو گئے تھے وہ خود علامہ مرحوم کی نگاہوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی لیکن ان کے فکر و بصیرت کا گرانقدر شاہکار "تذکرہ" آج بھی اپنی پہلی سی آب و تاب کے ساتھ دنیا کے سامنے موجود ہے اور ان کی علمی و فکری کاوشوں کے تابندہ نقوش آج بھی اس کے اوراق میں جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت آج تک فکر و بصیرت کی اساس پر ابھرتی ہوئی کسی بھی دعوتِ انقلاب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہوئی بلکہ اس نے پوری شدت سے ہر ایسی دعوت کو تکفیر کے تیروں سے چھلنی چھلنی کرنے کی سعیِ مسلسل جاری رکھی۔ علامہ صاحب کے "تذکرہ" کی اشاعت پر بھی کافرگری کا یہ ہنگامہ پورے زور و شور سے ابھرا اور کئی سال تک ہمارے "مقدسین" انہیں کافر قرار دینے کے لئے سرگرمِ کار رہے۔ اس زمانے میں طلوع اسلام میں علامہ المشرقی مرحوم کے "تذکرہ" سے چیدہ چیدہ اقتباسات شائع کر کے مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ کفرسازی کے ان ہنگاموں سے الگ ہٹ کر سوچیں کہ اس کتاب کے مصنف نے قرآنی حقائق کو کس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہم آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ مرحوم کی یاد منانے کا اس سے بہتر طریق کوئی نہیں کہ قوم کو علامہ کی اس گرانقدر تصنیف سے روشناس کرایا جائے۔ یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب تک اسی طرح شگفتہ و شاداب ہے۔ لیکن افسوس کہ ہماری "ستم پسند" قوم نے اسے نظروں سے ایسا اوجھل کر دیا ہے کہ ہماری نوخیز نسل کو شاید معلوم بھی نہ ہو کہ اس نام کی کوئی کتاب کبھی شائع ہوئی تھی۔ ہم آئندہ اوراق میں "تذکرہ" کے وہ چند اقتباسات شائع کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں جو اس زمانے میں طلوع اسلام میں شائع ہوا کرتے تھے۔

"تذکرہ" کے بصیرت افروز اقتباسات

۱۔ دین

جو بات حتمی اور قطعی ہے یہ ہے کہ زمین کا یہ کارگاہ جلیل کمالِ عدل و انصاف پر چل رہا ہے، صحت اور توازن سے چل رہا ہے، دھڑلے اور تمکنت سے، توڑنے اور زد سے چل رہا ہے۔ اس میں جو بات ہو رہی ہے نقد و نظر سے ہو رہی ہے، انتخاب و انتظام سے ہو رہی ہے، نظر و لحاظ سے اور غور و خوض سے ہو رہی ہے۔ اس کا محرک جل و علا وہ مالک سمیع و بصیر ہے، جو ہر شے کو بغور تمام دیکھ رہا ہے، پہنہائے زمین کو دیکھ رہا ہے، نسل انسانی کو دیکھ رہا ہے، امتوں کے اعمال کو دیکھ رہا ہے، افراد کے سعی و عمل کو دیکھ رہا ہے، بد و نیک کو، کہ و مہ کو، شاہ و گدا کو، بالا و پست کو دیکھ رہا ہے۔ اس منظم اور مضبوط، اس لرزہ فگن اور جمیع حکومت کے اندر استبداد کو قطعی نہیں، ظلم قطعاً نہیں، افراط و تفریط قطعاً نہیں، نواب کی لاٹ و بالیت اصلاً نہیں! مجھ کو یقین ہے کہ ملکوتِ جہاں کی اس اہم شق کا علم سب انبیائے کرام کو ملا اور دائمی آئینِ جزا و سزا کی خبر انہوں نے ڈنکے کی چوٹ دی۔ انہوں نے انسان کو اس زمین پر خوش اسلوبی سے رہنے کا ڈھنگ سکھایا۔

انہوں نے اجتماعی بقا کی راہ دکھلائی۔ انہوں نے اقوام کے مدّوجزر کے اصول بیان کئے۔ حکومت خدا کو ظلم سے قطعاً بری ثابت کر کے دنیاوی سزا کی تعیین کی، اُخروی جزاء و سزا کی تعیین کی، افراد کے طرزِ عمل کو ظاہر کیا۔ امتوں کو راہِ راست پر چلا کر صدیوں تک تمکن اور دوام دے گئے۔ نافرمانوں کو ان کی آنکھوں سے سزا ملتی ہوئی دکھلا گئے۔ یہی ان کا الدین" تھا، اور اسی دین، (طرزِ عمل) پر چلنے کا خدا متمنی تھا۔

۲۔ مقامِ نبوت

نبی کی نبوت اس کے اپنے زمانے میں وہ لرزہ فگن اور سکون بار نشے تھی کہ جو گروہ ان کے حلقۂ اثر میں آجاتا تھا اُن کے لئے پیکرِ عمل ہو جاتا۔ وہ رہنمائے جلیل اپنے گروہ ان شگافت علم اور پیہم عمل سے اپنی یقین انگیز تعلیم اور حوصلہ افزا تدلیس سے، اپنی پردہ کشا تبیین و تلقین سے قانونِ خدا اور اس کے امن افزا نتائج کو ہر مصاحب کی نظروں میں دو اور دو چار کی طرح عیاں کر دیتا۔ پھر عاملوں کا جم غفیر پروانہ وار اس کے گرد جمع ہو جاتا۔ اقل قلیل مدت میں وہ امت کامیاب اور فائز المرام ہو جاتی۔ اور حق و عمل کے اس دامن میں آیندہ نسلوں کو مدتوں عمل کی راہ دکھلاتی۔

کیا وہ سالار انبیاء اور ختم رسل محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام جن کے آسمان شگاف علم و عمل کو دیکھ کر رحمت ایزدی کا موسلادھار مینہ روئے زمین کو ابدالآباد تک تر بتر کرتا رہے گا، جن کے قانونِ بقا و فنا کی تعیین کو پا کر بحر و بر شمس و قمر اس پر سلام بھیجتے رہیں گے۔ جس کی قوت تغییر و انقلاب کا اندازہ کر کے مس خام کو کندن بننے کی دائمی آرزو رہے گی، کیا وہ سرورِ عالم فی الحقیقت ایک کنج نشین اور کملی پوش، ایک اُمّی اور نادان زاہد، ایک نا گفتنا و متوکل، اور فاقہ کش متقی، ہی تھا جس نے ایک اقل قلیل مدت میں عرب کی بے نام و نشان اور مجبور زدہ قوم سے علم و عمل کے وہ آتشین فوارے اکناف عالم میں رواں کئے کہ دنیا ہمیشہ تک ان کے کارناموں کو سن کر سر دھنا کریگی۔

۳۔ قرآن کریم

روئے زمین کے آسمانی کتب خانے میں صرف ایک قرآن ہے جو سب انسانی تصرف سے محفوظ رہا ہے۔ اس میں ایک حرف کے برابر کہیں تبدیلی نہیں ہوئی۔ الفاظ کی ترتیب میں، آیتوں کے الفاظ میں، سورتوں کی آیتوں میں یہ کتاب بعینہٖ وہی ہے جو پیغمبر آخرالزماں نے دنیا کو دی۔ کوئی تساہل کوئی کوتاہ نظری، بددیانتی یا خود غرضی، اس کو پہلے دن سے نقل کرنے میں نہیں ہوئی، نہیں بلکہ اس کے ایک پرانے نسخے کے متعلق جدید انکشاف جو حال میں ہوا ہے اس نے "محکماً" و "عملاً" ثابت کر دیا ہے کہ یہ وہی ہے جو پہلے تھی، وہی ترتیب ہے جو ایک دفعہ مقرر ہو چکی تھی، وہی نص ہیں، وہی الفاظ ہیں، سینوں کے جوف میں ہے تو وہی ہے، اور کاغذ کے میدان میں ہے تو وہی ہے!

دین کی سچی قدر، اس پر سچا اور بے ریا یقین، اس پر مسلسل اور نتیجہ خیز عمل، اس پر کامل اور لاینفک اتحاد درحقیقت علم ہی سے ہو سکتا ہے اور وہی صراطِ مستقیم صحیح معنوں میں بقا انگیز اور تقدم خیز ہے جس کے مسلم

اصول کی تائید براہ راست وحی سے ہوئی ہو۔

مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اس قانون خدا اور امر رب العلمین کی حقیقت تک بہ تمام وکمال پہنچنے کے لئے قرآن حکیم سے بہتر، کامل تر، واضح تر، اور صحیح تر آسمانی کتاب اس دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ سب آسمانی صحیفے اپنے اپنے وقت نزول سے آج تک کم و بیش لفظی تحریف کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے الفاظ وحی روئے زمین سے کلیتاً ناپید ہیں۔ اکثر میں مرور وقت کے باعث رد و بدل وارد ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ خود حاملان وحی کو اس حقیقت کا اعتراف ہے لیکن لفظی تحریف کا گناہ عظیم انسان نے کم از کم اس کتاب کے بارے میں ختماً نہیں کیا۔ قرآن حکیم کے مطالب اور مقاصد میں اگرچہ بے معنوی تحریف ہو چکی ہے۔ اس کا اصلی اور نبوی منشا جہلا اور علماء کی متفقہ تاویل کے باعث اکثر خبط ہو گیا ہے۔ اس کے معانی پر بے حد شرعی اور فقہی غلاف پڑ چکے ہیں اس کے کسی ایک امر مہم کا اصلی مفہوم صحیح طور پر مسلمانان عالم کے ذہنوں میں باقی نہیں رہا۔ اس کے اوامر و نواہی پر اعتقاد آج صرف اقوال اور اوصاف تک محدود رہ گیا ہے اس کو لوگ جو کچھ مان رہے ہیں مونہوں اور لفظوں، پھونکوں اور استخاروں سے مان رہے ہیں لیکن اس کے الفاظ بعینہٖ اور باصلہ موجود ہیں۔ انسان کا بڑے سے بڑا فریب بھی اب ان کو بدل نہیں سکتا۔ ان کی کچھ کتر بیونت نہیں کر سکتا۔ محقق کے لئے اس کتاب کا روئے زمین پر موجود ہونا ایک غیر مترقبہ نعمت اس لئے ہے کہ صحف آسمانی کے اضافی مطالعے میں قرآن حکیم کے الفاظ اور تحقیق شدہ مطالب کی رہنمائی صحیح منشائے خدا کی طرف سچی رہنمائی ہے۔ جہاں اور سب کتب آسمانی اپنی موجودہ حالت میں کسی ایک امر کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ وہاں قرآن اس امر کے متعلق اپنا قطعی اور آسمانی فیصلہ دے سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو مشترک باتیں آسمانی صحائف میں اس وقت پائی جاتی ہیں اور جن کا وجود اس آخری کتاب سے بھی ثابت ہے، ان سب کا قرآن صحیح معنوں میں مصدق بن جاتا ہے۔ اس مقام نظر سے اگر کوئی مزعومہ آسمانی کتاب کے اکثر مضامین اور قرآن کے مابین کوئی مابہ الاشتراک ثابت ہو گیا ہے تو اس مزعومہ کتاب کا اس کے اپنے عہد نزول میں منجانب اللہ ہونا بھی محقق ہے۔ الغرض مذہب کو علم کے بلند درجے تک پہنچانے کے لئے یہ گوہر نایاب از بس بے بہا اور گراں مایہ ہے۔ طالب حقیقت کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پاس کم از کم ایک ایسی کتاب موجود ہے جس کو خدا کے ہاں سے براہ راست ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور جو اب نامحرف اور بے غل و غش خالص ہے۔

یہ وہ خیالات ہیں جن کی بنا پر میں اس کتاب کو ساکنان زمین کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ قرآن حکیم اپنی جامعیت اور مانعیت میں، اپنی حجیت اور حکمت میں اپنے علم و فہم میں وہ فقید المثال کتاب ہے کہ اس کا علم انسانی دانست کے ہر ممکن معراج سے بالاتر ہے۔ سب آسمانی کتابیں قانون خدا اور دین فطرت کے صرف بعض یا اکثر حصوں کو پیش کرتی ہیں مگر یہ نادر الوجود صحیفہ اس کو بہ تمام و کمال پیش کر رہا ہے۔ انسانی معاشرت

اور تمدن، دنیا کی بہشت اور امن، علمی تقدم اور عمران، عملی فوقیت اور اقدام کا کوئی شعبہ نہیں جس کو حاصل اور برقرار رکھنے کے لئے اس کے اندر مکمل اور معنی خیز ارشادات نہ موجود ہوں۔ تہذیب کے ہر مرحلے میں، عمران کی ہر منزل میں، تقدم کے ہر قدم پر یہ کتاب انسان کے لئے سچی رہنما ہے۔ اس کی انگشت رہنما لا محالہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے جس طرف بالآخر نقصان ہے، اجتماعی ضعف ہے، مجموعی موت ہے۔ اس کا لب لباب خوف و خطر حکم آمیز صراط مستقیم کی طرف ہے جس پر چل کر امن ہے، خلد ونعیم ہے، نعمت اور عزت ہے۔ اس کا اہم ترین مطمح نظر امتوں کی اجتماعی حالت کی اصلاح ہے، لیکن اس مجموعی نصب العین رشد کے ضمن میں اس نے افراد کی شخصی فلاح کا اصل دستور العمل بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کو روئے زمین پر بھیجنے والا وہ صاحب علم و خبر، وہ مالک سمیع و بصیر اور وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے کہ بنی نوع انسان کے انتہائی ارتقاء کو ہزاروں بلکہ لاکھوں برس پہلے دیکھ رہا ہے صدہا برس کے گزشتہ واقعات کی سند پیش کر رہا ہے۔ امن کے لوازمات کی طرف اشارہ کر رہا ہے، خوف کے مقامات سے ڈرا رہا ہے۔ الغرض جو کچھ کہہ رہا ہے قوت اور زور سے کہہ رہا ہے۔ یقین اور وثوق سے کہہ رہا ہے غنا اور بے نیازی سے کہہ رہا ہے۔ اس کا قانون اس قدر مکمل ہے کہ نارسا نظریں اس میں عیب نکالتی ہیں۔ اس میں کجی دیکھتی ہیں۔ اس کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں مگر علم کی وسعت اور بلند بینی بیجا ان شکوک کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ہر شک کے متعلق نئے احوال، نئی معلومات، نئے مقام نظر آئے دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اور منکر کو بالآخر درماندہ اور سپر انداختہ کر دیتے ہیں۔ مقام نسائیت، تعدد ازدواج، ممانعت خمر، معاشری مساوات وغیرہ وغیرہ، چند در چند ایسے مسئلے ہیں جن کے متعلق دنیا، تمدن کے اس مرحلے میں قرآن سے ایک رائے و یک زبان ہو سکی۔ ان پر جب تک انسانی فطرت کا علم ناکامل ہے بحث کا سلسلہ جاری رہ سکے گا مگر ان مباحث و قیقہ کے متعلق قرآن کے قطعی اور حکمی فیصلے وہی ہیں جن پر دنیا کی عام رائے کا اہم ترین حصہ نامحسوس طور پر متفق ہو رہا ہے! وہ وہی ہیں جو تلخ تجربوں، فطری گناہ کی سزاؤں، نیشینی غفلتوں کے سم آلود نتیجوں، افراط و تفریط کے مہلک اور منقطع النسل اثرات اور ترقی علم سے اثبت ہو کر دنیا کو نئی راہوں پر لگا رہے ہیں۔ دنیا کسی کشمکش و پیچ میں گرفتار ہے۔ صراط مستقیم کی تلاش میں یہ غلط اور وہ صحیح بار بار کہتی ہے۔ زید سے ہٹ کر عمرو کی طرف اور عمرو سے بکر کی طرف راجع ہوئی مگر قرآنی محکمے ناقابل بدل اس لئے ہیں کہ بالآخر انسانی طبیعت انہی کی طرف مائل ہو کر رہیگی۔ اپنی فطرت سے بے خبر انسان انہی پر مجبول ہے۔ انہی سے ہٹ کر شکست و ریخت ہے۔ انہی پر چل کر حفظ و امن ہے! جہاں افسردگی ہے، اسی کے عصیاں ہمت ہے، جہاں بالش ہے اسی کو مان کر ہے۔ قرآن کا بتایا ہوا اسلام ایک فطرت ہے جس پر سب انسانی بلا امتیاز رنگ و نسل مخلوق ہے۔ اس میں کوئی تبدل اور تحول اصلاً! و طبعاً نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ صراط مستقیم ہے جس کے سوا کوئی دوسرا خط مستقیم بداہتہً ممکن نہیں، البتہ اگر لوگ اس کی تلاش میں ایک راہ سے ہٹ کر دوسری

راہ پر چل رہے ہیں تو اس کی وجہ کمیٔ علم ہے۔ جس دن فطرت انسانی کا علم مکمل ہو جائے گا، صراطِ مستقیم، سورج کی کرنوں اور مہتاب کی شعاعوں سے زیادہ روشن تر حقیقت ہو جائے گی۔ اسی بنا پر قرآن نے اپنے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم کے بارے میں کہا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم ۳۰)۔

اس کا کمال یا لطافت یہی ہے کہ اعلان کر دیا جائے کہ یہ کتاب مکمل ہے۔ مفصل ہے۔ گنجینۂ علم و حکمت ہے انسان سے اس کا مثیل پیدا ہونا محال ہے۔ آسان ہے مبین ہے، اختلاف سے مبرا ہے۔ صاحبِ علم و فکر قوم کے لئے ہے، ہدایت اور رحمت ہے، لاریب مرقع ہے، مربوط ہے!

۴۔ مادہ پرست یورپ کی غلطی

مغرب کے دانشورانِ علم بھی آج اپنی تمام تحقیق و تدقیق کو اشیائے فطرت کے خواص اور اجسام کائنات کے حقائق کی تلاش میں وقف کر رہے ہیں۔ وہ اپنا سب زور اسی میں صرف کر رہے ہیں کہ ابدان کا صحیح علم حاصل کریں۔ اور اس کی وساطت سے ترقی کے بام رفیع پر چڑھ جائیں۔ ان کا علم آج فلک الافلاک کی بلندیوں اور تحت الثریٰ کی گہرائیوں تک ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ فطرت کی صحت اور قوت پر اشیاء کی لامتناہی ممکنات اور ان افزا کیفیات پر ان کو یہ صبر کُل یقین ہے کہ کائنات کے ہر جزو بلا تجزیے کے اندر ان کو ایک پہاڑ پوشیدہ ہونے کا امکان نظر آ رہا ہے۔ وہ اس موشگافی اور دقیقہ آرائی میں عمریں صرف کر رہے ہیں۔ جانیں فدا کر رہے ہیں۔ حیرت انگیز صناعی قوت کی دوربینیں اور خوردبینیں دقیقہ رس آلات اور میزانیں اس عجوبہ گاہ فطرت کے ہر ذرے کو بغور تمام پرکھ رہی ہیں۔ لیکن خدا کے کہے ہوئے الفاظ ان کے نزدیک کچھ لائق التفات نہیں، کچھ قابل تفتیش نہیں۔ کچھ مجمل اور حامل المعانی نہیں۔ کچھ دقت نظر کے محتاج نہیں۔ کچھ دوربینی اور خوردبینی امتحان کے اہل نہیں۔ علم الابدان سے مغرب کو یہ انتہائی شغف ہے۔ لیکن علم الادیان کی طرف یہ بے توجہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اشیائے فطرت کے بے مثال علم اور ابدانِ عالم کے متعلق صحیح خبر کے باوجود مغرب کا دماغ ذہنی پریشانیوں اور دوام اذلیس مشتبہ امر ہے۔ وہ علم الدین سے کما حقہٗ بہت کم واقف ہیں۔ ان کو اس دنیا کے اندر صراطِ مستقیم کے ایک اہم حصہ کی کچھ خبر نہیں رہی۔ سیاست اور مادیت کے نادرا غلو نے نامعلوم طور پر یہ بات ان کی گھٹی میں ڈال دی ہے کہ اس دنیا کے اصلیت محض جسمانی زور اور مادی طاقت ہی ہے۔ یہی کثرِ مخلوق کے اخلاق کا جزوِ اعظم ہے، اسی کے اندر بقائے انواع کا راز ہے! وہ اس مادی زور کو بدرجۂ اتم حاصل کرنے کے لئے سب ممکن اشیائے کو کرایہ پر لے رہے ہیں اور ان کی وساطت سے زور آور بنتے ہیں لیکن افراد کی روحانی صلاحیت اور تہذیب نفس کے آسمان شکن زور کی ان کو کچھ خبر نہیں۔ وہ اپنی باطنی ملکوتی طاقتوں کو مادیت کی بے جان

قربان گاہ پر چڑھا رہے ہیں۔ اور بےرحم زمانے کے ہاتھوں ملیامیٹ ہو رہے ہیں! اسی غیر روحانی اور کرایہ پر لئے ہوئے زور کا اشد شدید مبلغ الماتیہ کی بے مثال جنگ ذہنیت تھی جس کا بیشتر حصہ حال[1] کے معارکۂ عظمیٰ میں تباہ ہوا اور اسی خواہش کا ادنیٰ مظہر انگریز کی قزاقانہ جوع الارض اور اس کا تکملہ استیلا ہے جو آج اس کی اجتماعی بیخ و بنیاد کو کھوکھلا کر رہا ہے!

الغرض جہاں تنزل پسند مغرب صلاحیت کو جسمانی قوت کی پیدا کی ہوئی سیاست کے ماسوا کچھ اور سمجھنا گناہ سمجھتا ہے اور مذہب کے اجنبی اور ناخوش آیند مہمان کو اس کے اصلی وطن (ایشیا) میں دھکیل کر زندگی اکڑ پر اس دنیا میں دوام کی لاطائل سعی کر رہا ہے وہاں مشرق کا فیلسوف اپنا لبہ روحانیت کے اصلی مفہوم کو خیرباد کہہ کر کمزوری اور جمود کی پاکبازی اور رہبہ فروشی سے ہی اپنے آپ کو صالح اور اپنے ہاتھوں آپ مٹ رہنے میں بقا کا راز عبث ٹٹول رہا ہے۔

میرا یقین ہے کہ سعی و سکون کے یہ دونوں مناظر افراط و تفریط کے مناظر ہیں، فنا و استہلاک کے مناظر ہیں حفاظ و امن کے مناظر نہیں! اس دنیا کی چاردیواری میں رہ کر کسی قوم کا سچا مذہب اس کے دوام و بقا کا مذہب رہا ہے۔ اور یہی سچی سیاست اور سچی صلاحیت ہے۔ دوام کے لئے جہاں اشد شدید زور کی قطعی ضرورت ہے وہاں اس زور کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی تزکیۂ نفس واحد اور آخری وسیلہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کرایہ پر لئے ہوئے انسانوں یا زر کے منتظر مزدوروں کی ایک جماعت اس دنیا کے اندر چند لمحوں کے لئے زور پیدا کر دے۔ اس میں سب لوازمات غلبہ و استیلا کے موجود ہوں، اس میں جو بات ہو لاجواب اور بے مثل نظر آئے۔ زور آور دل میں اشد زور ہو، مگر دل میں اشد کمزوری ہو، ایک طرف کمال ہیبت و انبساط ہو، دوسری طرف انتہا کا عجز ہو۔ لیکن ایسے زر خرید زور کو دوام قطعاً نہیں۔ اس میں اصلاح کی باطنی استقامت نہیں۔ اس میں بلور کی انکساری صلابت موجود ہے۔ لیکن فولاد کی اندفاعی لچک قطعاً نہیں۔ ایسی بنا کی مثال ایک مکڑی کے جالے کی ہے جس کو باد تند کا ذرا سا جھونکا کالعدم کر دیتا ہے۔ اور بعد ازاں اس دل آویز تعمیر کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ یورپ کے تمدن کا جزو اعظم ہی کمزوری اور نا دہندگی پر مبنی ہے۔ اقوام کے اس دنیا میں بقا کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افراد کا تعلق حتی الوسع صانع فطرت کے اخلاق سے حاصل ہو۔ اشرف المخلوق انسان نے کسی برتر مخلوق بننے کا تہیہ ہو، نہ یہ کہ سفلی پیدائش سے ارتقا کیا ہوا انسان، پھر اسی درکِ اسفل کی طرف لوٹ آئے۔ ایسی تہذیب اپنے پاؤں پر آپ تبر مار رہی ہے گو کہ اپنے زور کے نشے میں مافی الحال اس قدر مست ہو کر اس خودکشی کا کچھ اندازہ نہ کر سکے۔

---

[1] جنگ گزشتہ (سنہ ۱۹۱۸ء)

میرا یقین ہے کہ مغرب کو ایک نہ ایک دن اعمالِ خدا کے مشاہدے کو کچھ مدت کے لئے ملتوی کر کے الفاظِ خدا کے مطالعہ کی طرف آنا پڑے گا۔ اس دن ان کی سب حیرت اور مذبذب حالت تیقن میں بدل جائے گی۔ صراطِ مستقیم، کے بارے میں ان کے سب شکوک رفع ہو جائیں گے۔ صلاح کا اکثر غلط تخیل درست ہو ہو کر مکمل ہو جائے گا۔ ان کے علمِ فطرت سے مستنبط کئے ہوئے اکثر معاشرتی اور تہذیبی اصول کی تائید ہزاروں برس پیشتر کے کہے ہوئے الفاظ سے حیرت انگیز طور پر ہوگی۔ ان کو انبیاءؑ کے اس دنیا میں علمی مقام کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ اپنی غلط روی کے متعلق صحیح اور نتیجہ خیز معلومات ملیں گی۔ صحیح روی کی اہلی اور سرکاری سند مل جائے گی۔

۵۔ وحدتِ ملّت

میں اسلامی جماعت کے اندر سب تفرقی اور اعتقادی، سب اقوالی، اور اعمالی، سب اجتماعی اور غیر اجتماعی، سب شرعی اور فقہی تفرقے کے برخلاف ہوں۔ سب کو علانیہ مٹانا چاہتا ہوں۔ سب مطیعوں اور مطاعوں، مریدوں اور مرادوں کو خدا کی سرزنش کا قطعی اہل اور عذابِ آخرت کا قطعی مستوجب سمجھتا ہوں۔ لیکن با ایں ہمہ اگر کوئی شخص یا جماعت اس کتاب کے سارے مطالعے کے بعد عقیدتاً یا عملاً مجھ کو اسلام کے کسی نئے فرقے کا بانی تصور کرے تو وہ میری دانست میں نہ صرف مجھے حسبِ جہنم بنا رہی ہے بلکہ آگے جل کر جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں ابدالآباد تک جلتے رہنا اسی کا حصہ ہے!

اسلام میرے نزدیک سب اولیا و اصفیا سے گزر کر صرف محمد (صلعم) کی پیروی ہے یعنی ان کے لائے ہوئے قانون کی پیروی ہے۔ انبیاءؑ کے لائے ہوئے طریقِ عمل (دین) کی پیروی ہے۔ قانونِ خدا کی پیروی ہے۔ آئینِ رب العالمین کی پیروی ہے۔ قانونِ فطرت کی پیروی ہے۔

۶۔ علم و عمل

ہاں قرآن کو میں سرتاپا علم ثابت کرنا چاہتا ہوں مگر اسلام میرے نزدیک سرتاپا عمل ہے۔ اس کی توحید عمل ہے۔ اس کا ایمان عمل ہے، اس کا اتقا عمل ہے۔ اس کی عبادت عمل ہے، اس کا صراطِ مستقیم عمل ہے۔ اس کا شرک بدکاری ہے۔ اس کا کفر بدنظمی ہے، اس کا فسق بدعملی ہے، اس کا عمل امت کا اجتماعی عمل ہے۔ متحدہ اور متفقہ عمل ہے۔ ہاتھوں اور پیروں کا عمل ہے، دلوں اور جگروں کا عمل ہے۔ طاقت اور زور کا عمل ہے۔ دکھ اور تکلیف کا عمل ہے۔

خریدار توجہ فرمائیں

آپ کے چندہ کے ختم ہونے کی اطلاع پرچے میں منسلک کارڈ کی صورت میں دی جاتی ہے۔ جب بھی آپ کے پرچے میں یہ کارڈ منسلک ہو آپ فوری طور پر اس میں مطلوبہ شقوں پر نشان لگا کر بغیر ٹکٹ سپردِ ڈاک کر دیجئے۔ اس کارڈ کی ترسیل میں تاخیر کی صورت میں آپ کو اگلا پرچہ بذریعہ وی پی ارسال کر دیا جائیگا جس کی وصولی آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

خوشخبری

نئے سال ۱۹۶۴ء کے کیلنڈر :-

(۱) اسلامی، تاریخی اور آفس کیلنڈر

(۲) ہر قسم کے فینسی عید کارڈ

(۳) قطعات

مختلف رنگوں اور بالکل نئے ڈیزائنوں سے آراستہ دستیاب کرنے کیلئے ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

سہیل آرٹ پبلشرز - ۱- بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

بہترین رنگدار چھپائی

کا مرکز

سہیل آرٹ پرنٹرز

رائل پارک میکلوڈ روڈ - لاہور فون نمبر ۶۴۰۱۱

علمائے سے پوچھئے

پاکستان میں قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اٹھتے بیٹھتے یہ کہا جاتا ہے کہ قانون سازی کے سلسلے میں حضرات علمائے کرام سے پوچھئے کہ فلاں قانون، شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہم بھی حکومت سے شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ ایسا ضرور کیجئے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کے باہمی اختلافات کس قدر ہیں جن کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکے جس پر یہ تمام حضرات متفق ہوں۔ ہم نے (مثال کے طور پر) عائلی قوانین کے سلسلے میں یہ تجویز کیا تھا کہ شیعہ۔ اہلِ حدیث۔ دیوبندی۔ بریلوی اور جماعت اسلامی سے متعلق ایک ایک نمائندہ پر مشتمل ایک علماء بورڈ بنا دیجئے اور ان سے کہئے کہ عائلی قوانین کا ایک ایسا ضابطہ مرتب کر دیں جو ان کے نزدیک متفق علیہ ہو اور جس کا اطلاق پاکستان کے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ حکومت نے تو ایسا نہ کیا لیکن جو کچھ ہم نے کہا تھا اس کا ثبوت خود بخود مہیا ہوتا جا رہا ہے۔

مولانا محمد داؤد غزنوی جمعیت اہلِ حدیث کے صدر ہیں۔ انہوں نے موجودہ عائلی قوانین کے سلسلے میں لکھا کہ یہ ایسے نہیں کہ تمام کے تمام مسترد کر دئے جائیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں جزوی ترمیمات کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے اس پر جماعت اسلامی کے ترجمان "ایشیا" نے اپنی ۱۰ اگست کی اشاعت میں ان پر بڑی لے دے کی ہے۔ وہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے:-

> مولانا جب یہ استدلال کر رہے ہیں تو ہم حیرت کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ ان کے قلم سے مولانا محمد داؤد غزنوی امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث بول رہے ہیں یا منکرینِ سنت کے خلیل غلام احمد پرویز۔ حکومت کے سربراہ اور امیر مملکت کو — وہ کسے باشد — حضرت عمرؓ کے مقام پر رکھ کر شریعت اسلامی کی تعبیر کرنے کا حق دینا وہ عناں اور مضل نظریہ ہے جس نے عہدِ حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے، اور جس کی آڑ لے کر آج اسلام کا حلیہ، ترکی، مصر، انڈونیشیا۔

تیونس اور دوسرے ممالک میں لگایا جا رہا ہے۔ اور پاکستان میں بھی اس کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے اس نظریہ کے حق میں منکرینِ سنت بالکل وہی دلیل دیتے ہیں جو اہلِ حدیث مولانا غزنوی نے پیش فرمائی ہے۔

اور اس کے بعد اس مسئلہ پر ایشیا، اور جمعیت اہلِ حدیث کے ترجمان ــ الاعتصام ــ میں طویل طویل بحث چل پڑی ہے یہ عائلی قوانین کی صرف ایک شق پر جماعت اسلامی اور اہلِ حدیث میں باہمی اختلافات کی مثال ہے۔ اگر مختلف فرقوں کے نمایندگان یک جا بٹھائے جائیں اور عائلی قوانین کا پورا مجموعہ ان کے پیشِ نظر ہو تو اس وقت ان کے باہمی سر پھٹول کا جو منظر سامنے آئے گا اس کا اندازہ چشمِ تصور لگا سکتی ہے۔

ہم حکومت سے ایک بار پھر پرزور درخواست کریں گے کہ وہ ان حضرات پر مشتمل ایک بورڈ بنائے اور ان کے سپرد یہ کام کر دے۔ اس سے پاکستان میں نہ صرف قانون سازی کے راستے صاف ہو جائیں گے بلکہ سیاسی مفاد پرستیوں کے لئے مذہب کی آڑ لے کر جو خلفشار پیدا کیا جا رہا ہے، ملک کو اس سے بھی نجات مل جائے گی۔

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے روزنامہ کوہستان (بابت ۱۱ ستمبر ۱۹۶۳ء) آیا۔ اس میں مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی صاحب، مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے صدر ہیں اور مولانا حنیف صاحب اس جمعیت کے حلقۂ لاہور کے صدر۔ مولانا غزنوی صاحب بعض عائلی قوانین کو جزئی ترمیمات کے بعد قابلِ قبول سمجھتے ہیں۔ اور مولانا حنیف صاحب اس سے پہلے، اس مسودہ پر دستخط کر چکے ہیں جس میں ان قوانین کے کلیتہً منسوخ کر دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مختصر سے تعارف کے بعد مولانا حنیف صاحب کے انٹرویو کا متعلقہ حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

سوال:۔ حال ہی میں مولانا داؤد غزنوی کا جو مضمون عائلی قوانین کے متعلق شائع ہوا ہے کیا وہ جمعیت اہلِ حدیث کی جماعتی طور پر طے کردہ پالیسی کا ترجمان ہے۔ یا مولانا موصوف کے ذاتی نقطۂ نظر کا آئینہ دار۔

جواب:۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہے، کیونکہ یہ مضمون پہلے پہل جب الاعتصام میں شائع ہوا تو ابتدائی نوٹ میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ عائلی قوانین کے بارے میں یہ مولانا کی ذاتی آراء ہیں نہ کہ جماعتی موقف۔

سوال:۔ مولانا غزنوی نے اپنے حالیہ مضمون تعدد ازدواج کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے آپ کا اس بارے میں کیا ردِ عمل ہے۔ آپ کے خیال میں جماعت اہلِ حدیث من حیث المجموع مولانا کے ان خیالات کی تائید کرے گی؟

جواب:۔ مولانا غزنوی کے یہ ذاتی تاثرات ہیں جن کو قرآن و حدیث یا آثارِ صحابہؓ کی رُو سے ثابت نہیں

کیا جا سکتا۔ مولانا کا یہ ذاتی اجتہاد ہے جس کی پابندی جماعت اہلِ حدیث کے لئے نہ واجب ہے نہ مستحب ــ میرے خیال میں جماعت کا کوئی موقف تعددِ ازدواج کے حق میں اور عائلی قوانین کے خلاف ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمائی اس دعوے کی حقیقت کہ علماءِ کرام میں باہمی کوئی اختلاف نہیں! ذرا غور فرمائیے۔

(۱) عائلی قوانین ــــ نکاح۔ طلاق۔ تعددِ ازدواج۔ وراثت وغیرہ۔ ایسے مسائل نہیں جو اس زمانے میں پہلی بار پیدا ہوئے ہوں اس لئے ان پر غور و خوض کے سلسلے میں آراء میں اختلاف کی گنجائش ہو۔ یہ مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قرآن و حدیث میں متعین فیصلے موجود ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ان مسائل کے بارے میں کسی ذاتی اجتہاد کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

(۲) مولانا غزنوی صاحب جمعیت اہلِ حدیث کے صدر ہیں۔ اور مولانا حنیف صاحب، اسی جمعیت کے لاہور کے حلقے کے صدر۔ اب ظاہر ہے کہ نکاح و طلاق وغیرہ سے متعلق مسائل کے بارے میں؟ ان دونوں کو تو یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن و حدیث کے احکام کیا ہیں۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ مرکزی جمعیت کا صدر جو کچھ کہتا ہے، حلقۂ لاہور کا صدر اس کے متعلق کہتا ہے کہ قرآن و حدیث و آثارِ صحابہؓ کی رُو سے اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ مسلمانوں کے متعدد فرقوں میں سے ایک فرقہ (اہلِ حدیث) کی ایک ہی جمعیت کے دو ذمہ دار ترین ارکان کے باہمی اختلاف کا حال ہے؟ اس سے آپ مختلف فرقوں کے علماء حضرات کے اختلافات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس کے بعد ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ بڑا دلچسپ ہے۔

سوال نمبر:- اگر آپ تین طلاق کے سلسلے میں اپنے مسلک کا حنفیوں پر ٹھونسا جانا ناپسند کرتے ہیں تو پھر کیا آپ اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ آئندہ کسی موقع پر حنفیوں کا کوئی مسلک آپ پر ٹھونس دیا جائے۔

جواب:- جماعت اہلِ حدیث کو یہ قطعاً پسند نہیں کہ کسی ایک فرقے کا مسلک دوسرے فرقے پر ٹھونسا جائے۔ ہمارا نقطۂ نظر اس بارے میں وہی ہے جس کی وضاحت "اسلامی مملکت کے بنیادی اصول" کی دفعہ ۲ میں کی گئی ہے کہ ہر فرقے کے شخصی معاملات کے فیصلے اس کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور علیحدہ انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ اسی فرقے کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

آپ غور فرمائیے کہ کیا یہ اس حقیقت کا اعتراف نہیں جسے ہم پہلے دن سے کہتے چلے آ رہے ہیں ــــ کہ یہ ان حضرات کے بس کی بات ہی نہیں کہ یہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر سکیں جس کا اطلاق پاکستان کے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ یہ صرف اپنے اپنے فرقے کے لئے قوانین بنا سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی مملکت اس طرح چل بھی سکتی ہے کہ اس میں مختلف گروہوں کے لئے مختلف قوانین ہوں اور پورے ملک کے لئے کوئی مشترک قانون ہی نہ ہو؟

اور اگر آپ کہیں کہ نہیں صاحب! یہ بات صرف شخصی قوانین سے متعلق ہے۔ ملکی قوانین تمام مسلمانوں کے لئے یکساں ہوں گے۔ تو اس ضمن میں یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ

(۱) کیا شخصی اور ملکی قوانین کی اس قسم کی تقسیم، قرآن و حدیث سے کہیں ثابت ہے؛ اور کیا عہد نبی اکرمؐ میں ایسا ہی ہوتا تھا؟

(۲) جب شخصی قوانین کے متعلق ہر فرقہ کی فقہ الگ الگ ہے تو کیا ملکی قوانین کے بارے میں بھی یہی صورت نہیں؟ کیا آپ ملکی قوانین کے متعلق کوئی ایسی فقہ بتا سکتے ہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) ہم جمعیت اہل حدیث (بلکہ خود مولانا حنیف صاحب) سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ (مثلاً) طلاق کے متعلق جو فیصلہ فقہ حنفی کی رو سے دیا جائے گا کیا آپ اسے "قرآن و حدیث" کے مطابق تسلیم کریں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ اسے "قرآن و حدیث" کے خلاف قرار دیں گے؟ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ ایسی مملکت کو اسلامی مملکت قرار دیں گے جس میں (ایک فرقہ کو چھوڑ کر باقی) مسلمانوں کے معاملات کے فیصلے قرآن و حدیث کے خلاف کئے جائیں؟

ہم ملک کے سنجیدہ طبقے سے گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ اگر پاکستان کے لئے قانون سازی کو حضرات علمائے کرام کی منظوری کے ساتھ مشروط کر دیا جائے تو کیا اس ملک کے لئے کبھی کوئی ضابطہ قوانین مرتب ہو بھی سکے گا۔ ان کے لئے اس بات کا سوچنا اس لئے ضروری ہے کہ انہوں نے اور ان کی اولاد نے بالآخر اس ملک میں زندگی بسر کرنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی ایسے ملک میں امن کی زندگی بسر کی جا سکتی ہے جس میں کسی قانون کے بننے کا امکان ہی نہ ہو؟

اور اس کے بعد وہ سوچیں کہ یہ مذہب پرست طبقہ اس مملکت کو کس طرف لے جا رہا ہے؛ جب انہوں نے اس بات پہ غور کر لیا تو پھر یہ بات بھی ان کی سمجھ میں آ جائے گی کہ طلوع اسلام کیا کہتا ہے اور کیوں کہتا ہے اور مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت کیوں ہو رہی ہے؟

مُفت

دوا برائے — دمہ، دردِ گردہ و پتھری۔

ملنے کا پتہ

حاجی محمد دین شیخ آئس فیکٹری۔ متصل گنیش کھوپرا ملز۔ لارنس روڈ کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگالیں۔

باسمہ تعالیٰ

پاکستان کس نے بنایا؟

—شائع کردہ—

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کس نے بنایا؟

۱۱ ستمبر کی صبح ساڑھے نو بجے، قائدِ اعظم کے یومِ وفات پر بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک یادگار اجتماع میں محترم پرویز صاحب نے ایک بصیرت افروز خطاب ارشاد فرمایا۔ اس خطاب کو موقع پر ہی قلم بند کر لیا گیا تھا اور اب اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب سیمرغ[1] (PHOENIX) کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے آخری دن قریب آ گئے ہیں تو وہ اپنے گرد تنکے جمع کر لیتا ہے اور اس آشیاں میں بیٹھ کر دیپک راگ الاپتا ہے جس سے اس کے پروں سے شعلے نکلتے ہیں۔ ان سے اس کا آشیانہ بھی جل جاتا ہے اور وہ خود بھی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس راکھ پر بارش کا چھینٹا پڑتا ہے تو اس میں سے ایک نیا سیمرغ پیدا ہو جاتا ہے۔

قوموں کی حیاتِ نو

سیمرغ کے متعلق تو معلوم نہیں، لیکن جن قوموں میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہوتی ہے، حوادثِ زمانہ انہیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بھی کیوں نہ بنا دیں، ان کی خاکستر کے اندر سے دبی ہوئی چنگاری ابھرتی ہے اور اس سے ایک ایسا زندہ انسان پیدا ہو جاتا ہے جو اس قوم کو حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا جب کہا تھا کہ ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد — کہ جسے انگریز کی استعماریت نے "غدر" سے تعبیر کر کے تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی — مسلمان بکھر کر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے تھے۔ ان کی سلطنت ہی نہیں چھنی تھی، ان کی ملی ہستی ختم ہو گئی تھی۔ ۔ ۔

---

[1] یہ ایک افسانوی پرندہ ہے۔ کوئی اسے سیمرغ کہتا ہے، کوئی ققنس، کوئی موسیقار۔

۱۸۵۷ء کے بعد

ایک قوم کی حیثیت سے باقی ہی نہیں رہے تھے۔ انگریز کی سیاست نے یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَهُمْ کی ملت کش پالیسی اختیار کر کے ایک بار پھر فرعونی استبداد کی یاد تازہ کرا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام ان مسلمانوں سے لے گا جو کسی نہ کسی طرح زندہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ہر اقدام کا مورد مسلمانوں کو ٹھہرا دیا۔ لائل محمڈنز آف انڈیا کے مصنف کے الفاظ میں

> اس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا تھا، شوراہ سے رام دین اور ماتا دین نے ہی برپا کیوں نہ کیا ہو۔ کوئی بلا آسمانوں سے ایسی نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں ایسا نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ یہ مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ مشہور نہ کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا ہے۔

یہی تھے اس قوم کے وہ ناکردہ گناہ جن کی پاداش میں ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب (دی انڈین مسلمانز) میں تجویز کر دیا کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام لکڑہاروں اور سقاؤں سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

لیکن عین اسی زمانے میں خود انگریزی حکومت کے ایک دفتر کا معمولی ملازم (صدر امینی کا سررشتہ دار) جس کے بچپن اور جوانی کا زمانہ، خود اس کے اپنے الفاظ میں، "کبڈی کھیلنے، کنکوے اڑانے اور نائچ مجرے دیکھنے میں گزرا تھا" اس قوم کی

سرسیّد کی نمود

خاکستر سے چنگاری بن کر ابھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے قوم کے عروقِ مردہ میں زندگی بخش حرارت بن کر سرایت کر گیا۔ جب اس کے دل میں قوم کو سنبھالنے کا احساس بیدار ہوا ہے تو فضا میں چاروں طرف چھائی ہوئی مایوسی کا عالم کیا تھا، اس کے متعلق اس نے بعد میں خود کہا تھا کہ

> میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور سرفراز عزت پانے کے قابل ہو جائے گی۔۔۔
> آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔

یہ مسیحائے ملت، کہ قوم کے غم نے جس کے جوانی ہی میں بال سفید کر دئے تھے، سید احمد خان تھا، جو بعد میں سرسید کے نام سے متعارف ہوا۔ اس زمانے میں بھی اس کے دل میں قوم کے غم کی گہرائی اور کیریکٹر کی بلندی کی کیا کیفیت تھی، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ اس نے اس عالمگیر خلفشار کے زمانے میں محض انسانی ہمدردی کی بنا پر بہت سی انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی تھی۔ حکومت نے اس کی ان خدمات کے صلے میں راجہ ساسے چاندپور کی ضبط شدہ جاگیر اور اس کے

کیریکٹر کی بلندی

ساتھ ایک معقول جائداد پیش کی لیکن اس نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ

> "ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی۔"

اُس نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تقریر میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

> میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائدادیں لے کر تعلقہ دار بنوں۔ چنانچہ میں نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یاد رہے کہ سرسید اس زمانے میں انگریزی حکومت کا ملازم تھا۔ اور وقت ایسا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کی پیشکش سے انکار اس شخص کو باغیوں کے زمرے میں شامل کر دینے اور پھانسی کے تختے پر لٹکوا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد سرسید کھل کر سامنے آگیا۔ اور ایک طرف مسلمانوں کو انگریز کے استبداد اور ہندو کی دسیسہ کاریوں سے بچانے اور دوسری طرف ان بکھرے ہوئے تنکوں کو اکٹھا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ وہ اس زمانے میں کہا کرتا تھا کہ

> میں جب رات کو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو اُس کے اُس حصے کی جو نیلا نیلا، سیاہ، اور ڈراؤنا سا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا بلکہ ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمکتے ہیں اور معشوقانہ انداز کی کشش سے ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

ستاروں کو دیکھنے کی تمنا

اور پھر وہ اپنے ساتھیوں سے سوال کیا کرتا تھا کہ

> کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی نگاہ میں باعزت بنا سکتے ہو؟

وہ قوم کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا اور قوم کے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام اس پر کفر کے فتوے لگانے کے جہادِ عظیم میں مصروف تھے اور سارا زور اُسے ملحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، دجال، مرتد اور کافر ثابت کرنے میں صرف فرما رہے تھے۔ اس میں ہر فرقہ کے مولوی صاحبان شامل تھے۔ حتیٰ کہ جب فتویٰ پر چوٹی کے ساٹھ مولویوں کی مہروں اور دستخطوں سے

کفر کے فتوے

سرسید کی تکفیر پر اجماع ہو گیا تو پھر یہ حضرات یہاں سے بھاگے بھاگے مکہ معظمہ پہنچے تاکہ حرمین شریفین کی مہروں سے فتوے کی محکمیت کو اور زیادہ ثبت کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی فرما دیا کہ

> یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی طرف مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے۔

سرسید، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، شہر بہ شہر، کوچہ بکوچہ، قوم کا درد دل میں لئے، اس کی زندگی اور فلاح و بہبود کے لئے دیوانہ وار پھرتا تھا اور یہ حامیانِ شرعِ متین اور مفتیانِ دینِ متین، کفر کے فتوؤں کا انبار اٹھائے، اس کے پیچھے لگے رہتے اور لوگوں کو تلقین کرتے پھرتے کہ اگر نجات چاہتے ہو تو اس شخص کی کوئی بات نہ سننا۔ اس کے جواب میں سرسید کیا کہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اسی تکفیر کے ہنگاموں اور گالی گلوچ کے جلو میں علی گڑھ مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں لاہور آیا تو ایک اجتماع

عظیم میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا۔

فتوے کا جواب

اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اُسے اپنا خادم اور خیر خواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کے لئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے آرام پاتے ہیں۔ یا آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ چار۔ قلی۔ کافر۔ بت پرست۔ بدعقیدہ۔ سب مزدور کام کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھے بھی اس مدرسہ (علی گڑھ) کے قائم کرنے میں ایک قلی اور چار کی مانند تصور کر لیجئے اور میری محنت اور شفقت سے اپنے لئے گھر بنتے دیکھئے۔

سرسیدؒ کی یہ ساری کوششیں کس مقصد کے لئے تھیں؟ اس مقصد کے لئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ـــــ جو بکھرے ہوئے تنکوں کی طرح فضا میں منتشر تھے پھر سے تیرازہ بندی کی جائے تاکہ وہ اس ملک میں قائم بالذات اور مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مسلمانوں کو یہ حیثیت دینے کے لئے نہ انگریز تیار تھا نہ ہندو رضامند۔

دو الگ الگ قومیں

انگریز انہیں ایک باغی مذہبی فرقہ تصور کرتے تھے اور ہندو انہیں اچھوت قرار دینے کے درپے تھے۔ لیکن سرسید نے ان دونوں کے علی الرغم، اعلانیہ کہہ دیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔

اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب سے اُبھرے گا جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔

سرسیدؒ نے یہ الفاظ (۱۸۶۹ء میں) بنارس کے کمشنر مسٹر شکسپیر کے سوال کے جواب میں کہے تھے ـــ پاکستان کی بنیاد اس نظریہ پر استوار ہوئی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اس لئے ان کی مملکتیں بھی الگ الگ ہونی چاہئیں اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ اعلان، اس بنیاد کی پہلی اینٹ ہے جو آج سے سو سال پہلے سرسید کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اس

پاکستان کی پہلی اینٹ

اینٹ کو رکھتے ہوئے اس نے دارالعلوم کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی یقین رکھنے سے ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں باتوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہو گی۔

یہ تھا پاکستان کا معمارِ اول ـــــ سر سیدؒ ـــ جس پر یہاں سے لے کر مکہ معظمہ تک کے علمائے کرام نے کفر و الحاد کے فتوے لگائے تھے۔ سوچئے کہ اگر قوم اس وقت ان فتوؤں کا اثر قبول کر لیتی تو ہم گنہگاروں کا ایک طرف، خود اس مقدس طائفہ کی اولاد کا کیا حشر ہوتا؟ ان میں سے کوئی بھی عبداللہ اور عبدالرحمٰن نہ ہوتا ــــ سب لالہ گردھاری لعل یا مسٹر فضل مسیح ہوتے۔

سر سیدؒ نے آنکھیں بند کیں تو اس شمع کو سیالکوٹ کے ایک نوجوان کے سپرد کر دیا، جو اس زمانے میں ہنوز،

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبالؒ

کا وطنی ترانہ گایا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ یورپ گیا اور وہاں وطنیت یا قومیت (نیشنلزم) کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس پہ قرآن کریم میں بیان کردہ یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ قومیت کی بنیاد مشترکہ آئیڈیالوجی (یا ایمان) ہے۔ وطن کا اشتراک نہیں۔ چنانچہ جب وہ وہاں سے واپس آیا تو اس کی زبان پر ـــــ

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا ـــ کی جگہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تھا۔ اس زمانے میں یہاں قومیت پرستی کا بڑا چرچا تھا۔ اس لئے کہ یہ تصور ہندو اور انگریز دونوں کے لئے مفید تھا ـ اقبالؒ کی نگہ دوررس نے مسلمانوں کے لئے اس عظیم خطرے کو بھانپا اور جو بات سر سیدؒ نے پچاس سال پہلے مجملاً کہی تھی اسے شرح و بسط کے ساتھ کہنا شروع کر دیا۔ اس نے نظریۂ وطنیت کے فریب خوردہ مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو!

مسلم قومیت کا معیار

ترا لا سا ئے جہاں نے اسکو عرب کے معمارؐ نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے !
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے

بازو ترا، توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے !

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

وہ یوم اول سے اپنے آخری سانس تک اسی پیغام کو دہراتا چلا گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ فضا اس سے متاثر ہو گئی ہے تو اس نے، الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہے اس لئے اس کی مملکت بھی الگ اور آزاد ہونی چاہیئے تاکہ یہاں میں قرآن کے احکام و قوانین کو ایک زندہ حقیقت کی طرح نافذ کر کے صحیح اسلامی زندگی بسر کر سکے۔

پاکستان کا اولین تصور

حضرات علمائے کرام نے اقبالؒ کے خلاف پہلے ہی کفر کے فتوے صادر کر رکھے تھے اس اعلان نے گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مار دیا۔ قومیت پرست علمائے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا۔ وطن کے اشتراک پر ہندو اور مسلم کی متحدہ قومیت کے جواز میں بزعم خویش خدا و رسولؐ کے "ارشادات" پیش کئے جانے لگے۔ اس طائفہ کے سرخیل، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے برملا کہا کہ

اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔

مولانا حسین احمدؒ مدنی

چونکہ یہ الفاظ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی زبان سے نکلے تھے اسلئے ان سے اقبالؒ کے دل پر چھری چل گئی۔ اس کے سینۂ پرسوز سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی جس نے ان زندۂ جاوید اشعار کی شکل اختیار کر لی کہ

عجم ہنوز نداند رموز دیں، ورنہ — ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است

اس کے بعد مولانا مدنی کے جواب پر انہوں نے جو بیان شائع کیا وہ اس موضوع پر گویا حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے اس میں انہوں نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا۔[۱] اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

۱؎ اقبالؒ کا یہ خدشہ کس قدر صحیح تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حال ہی میں اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل کی اشاعت میں اسرار احمد آزاد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کی جلی سرخی یہ ہے کہ

> یہ الزام غلط ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں سلطنت اسلامیہ کیلئے کوشاں ہیں۔ اور نفس مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ — دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔ (طلوع اسلام بابت جولائی ۶۳ء)

اور اس کا خاتمہ انہوں نے ان الفاظ پر کیا کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا۔ بولنا۔ روپیہ صرف کرنا لاٹھیاں کھانا۔ جیل جانا۔ گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کو اس واقعہ سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ پھر بستر سے اٹھ ہی نہ سکے۔ اور اس کے چند ہی روز بعد ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ لیکن پاکستان کی بنیاد کی جو اینٹ سرسیدؒ نے رکھی تھی وہ اسے اپنی عمر بھر کی محنتِ شاقہ سے اتنا اونچا لے گئے کہ اس پر گویا چھت ڈالنا باقی رہ گیا۔ کیسے عظیم تھے پاکستان کے یہ معمار اور کتنا بڑا ہے ملتِ اسلامیہ پر ان کا احسان۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبالؒ کے بعد

مرتے وقت یہ شمع کس کے ہاتھ میں دی ہے؟ علامہ اقبالؒ کی نگہ حقیقت بین نے اس کا انتخاب بہت پہلے کر لیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس ہجوم میں ایک مردِ راہ بیں ایسا ہے جس کے سپرد یہ امانت نہایت اطمینان اور وثوق سے کی جا سکتی ہے۔ یہ تھے مسٹر محمد علی جناح بار ایٹ لا۔ جنہیں ملت کی متحدہ آواز نے قائدِ اعظم کہہ کر پکارا اور انہوں نے اپنی بے لوث خدمت، بے پناہ محنت اور بلند ترین کیریکٹر سے ملت کے اس اعتماد کو صحیح کر دکھایا۔

سرسیدؒ نے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کمشنر سے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور دونوں دل سے کسی کام میں اشتراک نہیں کر سکتیں۔ اقبالؒ نے ۱۹۰۶ء میں کہہ دیا تھا کہ ـــ بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے۔ اور جناحؒ نے اب مسلمانوں کے لئے ایک الگ آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد اس دعوے پر رکھی کہ

قائدِ اعظمؒ ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں

ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (ایڈورڈز کالج پشاور کی تقریر ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء)

اس سے پہلے انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں۔

اس سے دو ہفتہ پہلے (۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو) انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک اہم تقریر کی۔ اس میں سوال زیر نظر یہ تھا کہ پاکستان کے تصور سے مطلب کیا ہے؛ یہ یکایک سامنے کیسے آگیا۔ ان سوالات کے جواب میں قائداعظم نے دو فقرے کہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان دو فقروں میں پاکستان کے مطالبہ کی ساری تاریخ سمٹا کر رکھ دی۔ آپ نے فرمایا۔

پاکستان کب وجود میں آیا تھا؟

پاکستان اُس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

آپ نے غور کیا کہ کتنی عظیم حقیقت ہے جسے ان چند الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ جس دن پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا اس دن ایک جداگانہ قوم وجود میں آگئی تھی اور یہی چیز مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ الفاظ کس کی زبان سے نکل رہے تھے؟ اس مسٹر جناح کی زبان سے جو ابھی کل تک بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ

I AM NATIONLIST FIRST NATIONLIST SECOND & NATIONLIST LAST.

قائداعظم اس کا اعلان کرتے جا رہے تھے اور اسلام کے علمبردار حضرات علمائے کرام چاروں طرف سے یورش کر کے ان کی مخالفت میں امنڈے چلے آ رہے تھے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر محض ایک وطن کے باشندے ہونے کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور یہ تصور باطل ہے کہ اسلام کو ایک زندہ حقیقت بننے کے لئے

علماء کی طرف سے مخالفت

آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہے جس میں حکومت قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وہ کہتے تھے کہ سیکولر انداز کی جمہوری حکومت، جس میں غیر مسلم (ہندو) اکثریت قانون وضع کرے، عین مطابق اسلام ہے بس اتنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا پرسنل لاء (شخصی قانون) یعنی نکاح طلاق وغیرہ سے متعلق معاملات علمائے کرام کے ہاتھ میں رہیں۔ وہ تھا مسٹر جناح کا دعویٰ اور یہ تھا حضرات علمائے کرام کا مسلک۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ تعجب انگیز اور تاسف خیز تماشا شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو کہ داڑھی مونچھ منڈا، سوٹ بوٹ میں ملبوس، مغرب کا تعلیم یافتہ مسٹر جناح مسلمانوں سے یہ کہہ رہا ہو کہ

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب،

معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، پولیس اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔ (۱۹۴۵ء میں عید کا پیغام)

مولانا آزادؒ مرحوم

اور اس کے برعکس امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) مسلمانوں کو اس کانگریس میں شرکت کی دعوت دیتے ہوں جس کی قیادت مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ مہاتما گاندھی کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو تھکنے نہیں دیتا۔ (خطبۂ صدارت پرتاپ گڑھ کانگریس)

یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے جو بڑے فخر سے اعلان کرتا تھا کہ

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں اور اپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جز سمجھتا ہوں۔ اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا ... میرے جسم کا ذرہ ذرہ ہندو ہے

(بحوالہ خطبۂ صدارت قائداعظم، مسلم لیگ سیشن دہلی۔ اپریل ۱۹۴۳ء)

مسٹر جناح پہلے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ

وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اور پھر خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے کہ۔

وہ بندھن، وہ رشتہ۔ وہ چٹان۔ وہ لنگر۔ خدا کی عظیم کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا۔ ایک رسولؐ۔ ایک کتاب۔ ایک امت۔

(لیگ سیشن کراچی ۱۹۴۳ء)

اس کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) فرماتے ہیں کہ یہ تخیل کہ مسلمان بر بنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو اور دوسری مسلمان۔ انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔
(خطبۂ صدارت۔ پرتاپ گڑھ کانگریس)

اور اس کے بعد وہ سینے کے پورے زور سے اعلان کرتے ہیں کہ

میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ (ایضاً)

دورالہلال کے ابوالکلام آزاد

یہ وہی ابوالکلام آزاد ہیں جو کسی زمانہ میں کہا کرتے تھے کہ

انسان کی اجتماعی حیات اور قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائق نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ انبیائے کرامؑ کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا بجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو خواہ الجیریا کا وحشی ہو۔ خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندان توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں لیکن یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔۔۔۔ پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام، رنگ، زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔۔۔۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔

وہ ابوالکلام آزاد جو اپنے دورالہلال (۱۹۱۲-۱۳ء) میں یہ کہتا تھا، اب کیا کہہ رہا تھا، اے برادران عزیز! ذرا کلیجہ تھام کر سنئے۔ مولانا آزاد اپنی اس کتاب میں جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے (اور جو شائع ان کی وفات کے بعد ہوئی ہے) لکھتے ہیں:۔

مولانا آزاد کے آخری الفاظ

لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی۔ لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں، مذہبی یگانگت اور وحدت پیدا ہو سکتی ہے بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری کی تشکیل چاہی تھی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے بلند

ہو کر وجود میں آئے لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر سے عرصے کے بعد جب زیادہ سے زیادہ سو سال کا عرصہ کہئے، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ملکوں کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے۔ (INDIA WINS FREEDOM. P.227)

استغفراللہ۔ استغفراللہ۔ مولانا آزاد کا کہنا یہ ہے کہ اسلام نے دین کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کی کوشش کی لیکن وہ تجربہ ناکام رہا۔ اور اب اسے دہرانا حماقت اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا بہت بڑا فریب ہے۔ یہ وہی آزاد ہیں جو مسلمانوں کو برسوں تک یہ دعوت دیتے رہے کہ

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے ... دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

سچ ہے انسانی عروج کی تو ایک انتہا ہوتی ہے لیکن جب وہ پستی کی طرف گرتا ہے تو اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہوتی۔ جن غیر مسلموں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت میں جذب ہو جانے پر اب مولانا فخر محسوس کیا کرتے تھے ان کے متعلق وہ کبھی مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ

کفار سے سازباز مت کرو

کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزت نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ دعوہ استوار ہے۔ اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام کرتے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے ... لہٰذا ان سے مسلمانوں کو سازباز نہیں رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔

(الہلال۔ ۲۸ اگست ۱۹۱۳ء)

بہرحال وہ تھی مسٹر جناح کی دعوت اور یہ تھی ہمارے علمائے کرام کی حالت۔ ہم نے اس باب میں مولانا آزاد (مرحوم) کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ یہ قومیت پرست علماء کے امام تھے ورنہ باقی حضرات بھی مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی مخالفت میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن یہ خدا کا بندہ تھا کہ مخالفتوں کے اس تمام طوفان میں روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ اور اپنے مبنی بر صداقت مطالبہ کی توضیحوں سے باطل کی تاریکیوں کو ہٹاتا اور مٹاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی مسلسل جدوجہد اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا جسے اس نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۳ء میں پنجاب مسلم

پاکستان کا پختہ تصور

اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس میں) تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا کہ

پاکستان کے تصور کو جو اب مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح

سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت۔ نجات اور تقدیر کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ ابھی سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گزشتہ کو از سر نو زندہ کرے گی۔

پھر انہوں نے (۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو) فرنٹیر مسلم لیگ پشاور کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا

مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیر مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا۔

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

مسٹر جناح اپنی اس پکار کو برابر دہراتے جارہے تھے اور مولوی حضرات اسلامی حکومت کے اس مطالبہ کی مخالفت میں دن بدن تند و تیز ہوتے جارہے تھے۔ ہم نے اس سے پہلے ان کی مخالفت کے جس گوشے کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق نیشنلسٹ علما اور اس ملک کی دیگر جماعتوں سے تھا۔ مثلاً جمعیت العلمائے ہند۔ مجلس احرار۔ آزاد مسلمان۔ انصار۔ سرخپوش وغیرہ۔ لیکن ان کے علاوہ ایک گوشہ ایسا بھی تھا جس کی طرف سے مخالفت کا انداز ہی نرالا تھا۔ یہ تھی جماعت اسلامی

جماعت اسلامی

اور اس کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب! یہ متحدہ قومیت کے بھی مخالف تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مطالبہ پاکستان کے بھی دشمن۔ اس عداوت میں یہ حضرات نیشنلسٹ علماء سے بھی دو قدم آگے تھے۔ آپ نے ان چند اقتباسات سے، جنہیں پہلے پیش کیا گیا ہے دیکھ لیا ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے کس طرح صاف ہیں اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو واشگاف کیا ——— اور بہ تکرار و اصرار واشگاف کرتے چلے گئے کہ پاکستان سے مراد ایک ایسی اسلامی مملکت کا قیام ہے جس میں قوانین اسلامی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن مودودی صاحب۔ یہ کہہ کر مسلمانوں کو اس مطالبہ کی حمایت کرنے سے باز رکھنے کے جہاد عظیم میں مصروف تھے کہ

غلط بیانی

مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۲۷۔ فٹ نوٹ)

آپ نے غور فرمایا آپ ان تمام اعلانات اور بیانات کی موجودگی میں جو مسلم لیگ کے دوسرے درجے کے لیڈر تو ایک طرف،

—— خود علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کی طرف سے شائع ہوئے تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے، یہ کہنا کہ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے، کس قدر دیدہ دلیری ہے!

اور آگے بڑھئے ان کی مخالفت کی آگ اسی سے ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔

مسلمانوں کی کافرانہ حکومت

(ایضاً ص۲۹)

جب ان سے کہا جاتا کہ اس وقت ہندو اور انگریز سے جنگ اس بات پر ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین حاصل کیا جائے جہاں یہ آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ جب یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے گا تو اس میں مسلمانوں کو یہ اختیار و اقتدار حاصل ہوگا کہ وہ اسلامی حکومت قائم کر لیں۔ اگر آزاد خطۂ زمین ہی مہیا نہ ہو تو اسلامی حکومت کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے۔

ناممکن ہے

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (ایضاً ص۶۰)

واضح رہے کہ اب وہی مودودی صاحب، پاکستان کے خطۂ زمین میں اپنے تصور کے مطابق اسلامی اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں اور اس اسلامی اسٹیٹ کی بنیاد اس جمہوری نظام کو قرار دے رہے ہیں جس کے متعلق انہوں نے فرمایا تھا کہ اس کے نتیجے میں جو حکومت قائم ہوگی وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد۔

یہ سب قرآن سے بے بہرہ ہیں

یہ تو رہی ان کی مخالفت مطالبۂ پاکستان کی۔ اب یہ سنئے کہ یہ صاحب، اس مطالبہ کو پیش کرنے والوں کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ وہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں لکھتے ہیں۔

افسوس کہ ایگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔

(مطبوعہ ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ صفحہ (۴۴۱))

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

ان کے خیالات۔ نظریات۔ اور طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نور ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔

(ایضاً صفحہ ۴۴۲)

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ سے چھوٹے سے چھوٹے مسائل تک میں بھی قرآن کا نقطۂ نظر معلوم نہیں! اس شخص (قائداعظمؒ) کے متعلق جس کی قرآن کریم کے حقائق پر غائر نگہی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب وہ اگست ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد (دکن) گئے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے کچھ سوالات پوچھے۔ سنئے کہ سوالات اور ان کے جوابات کیا تھے؟

قائداعظمؒ کی قرآنی بصیرت

انہوں نے پوچھا: مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

قائداعظمؒ نے جواب دیا۔ "جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن، خدا اور بندے کے باہمی پرائیوٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک، مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

قرآنی مملکت

زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے

اشتراکیت

پھر انہوں نے پوچھا۔ اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

قائداعظمؒ نے جواب دیا۔ "اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک درحقیقت اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا

ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔"

اب اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ جو میرے نزدیک اس موضوع پر مقطع کا بند ہے۔ غور سے سنئے۔

سوال: اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب:۔ "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی اور نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

صرف قرآن کی اطاعت

یہ تھا مخالفتوں کا وہ ہجوم جس میں یہ نحیف و نزار سا مردِ مجاہد، قوم سے ایک پیسہ لئے بغیر پاکستان کی چومکھی لڑائی تنہا لڑ رہا تھا۔ اور اس کی مخالفت کی یہ کیفیت تھی کہ یہ لوگ سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر، بازاریت کی پست ترین سطح پر اتر آئے تھے۔ اس سطح پر ان کے طنز و استہزار کی کیفیت کیا ہوتی تھی، اس کا اندازہ، جماعت اسلامی کے ایک رکن رکین۔ نصر اللہ خاں صاحب عزیز (جو آج کل ایشیا کے مدیر ہیں) کے ایک صحافتی شاہکار سے لگائیے جو ان کے اخبار "کوثر" کی ۱۳ر جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔

استہزار

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

اور اس عنوان کے نیچے لکھا تھا۔

اس زمانہ میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی قوموں کو انہوں نے اپنی زمین پستی سے اٹھا کر آسمان رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اخبار خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا۔ "ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی۔" بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی۔ اشتہار بازی کا اصول یہ ہے کہ اشتہار دیئے جاؤ کسی نہ کسی روز تو گاہک پیدا ہوں گے۔ مہدی علیہ السلام سے لے کر مسولینی تک کی ضرورت کا جو اشتہار مسلسل ان کے جریدہ خیال میں نکل رہا تھا، آخر کار نتیجہ خیز ہوا۔ اور مسٹر جناح نے اپنی درخواست قوم کے حضور میں گزران دی

قوم نے باقی سب امیدوارانِ قیادت کو برخاست کر دیا اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔
اور قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے فضائے ہند معمور ہو گئی۔ (بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص ۳۶)

یہ جنوری ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ قائداعظم طنز و استہزاء اور تحقیر و تذلیل کے ان تیروں کو بھی اپنے سینے پہ لیتے اور انتہائی ضبط و استقلال سے اپنے دل میں سمو لیتے تھے۔ انہیں اس کی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ ان خاردار جھاڑیوں میں اپنا دامن الجھائیں۔ وہ جن کے دامن پر اسلامیت کی کوئی چھینٹ بھی نظر نہیں آتی تھی، ان سرتاقدم اسلامی پیکروں سے بہت اونچا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مستانہ وار آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں اسے منزل قریب نظر آ رہی تھی اس کے ذوقِ سفر میں اور تیزی اور تازگی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسی جذب و انہماک سے اپنے بے سروسامان قافلہ کو لئے آگے بڑھتا گیا، تا آنکہ اگست ۱۹۴۷ء میں منزل نے خود آگے بڑھ کر اس کے قدم چومے۔ اور اس نے انگریز، ہندو اور خود مسلمانوں کے مزعومہ علمبردارانِ اسلام و شریعت کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، اپنے کارواں کو سرزمینِ پاکستان میں آن اتارا۔ اور اس طرح جس عمارت کی پہلی اینٹ، سرسید کی نگہ دوربین نے رکھی تھی اور جس کی دیواریں اقبالؒ کی قرآنی فکر نے اوپر اٹھائی تھیں، وہ قائداعظمؒ کی بصیرت و کردار کے صدقے تکمیل تک پہنچ گئی۔

پاکستان بن گیا

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

قائداعظمؒ نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ ایک خطۂ زمین کا حصول، ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں، یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی مملکت کا قیام، چنانچہ انہوں نے اس خطۂ زمین پر قدم رکھنے کے بعد اپنے رفقاء کو وضاحت سے سمجھا دیا کہ وہ کہیں اسی کو مقصود و منتہیٰ سمجھ کر آرام سے نہ بیٹھ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں (خالق دینا ہال کراچی میں) عمالِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

یہ خطۂ زمین مقصود بالذات نہیں

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں۔ اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

اسلام کا عدلِ عمرانی

اسلام کے عدلِ عمرانی کے وہ اصول کیا ہیں جنہیں بروئے کار لانے کے لئے، قائداعظمؒ کے الفاظ میں اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ اس کا جواب صاف اور واضح ہے اسلامی

نظام کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد کی تمام مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد کی زندگی میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے افراد مملکت کو ان کی بنیادی ضروریات زندگی کی طرف سے بے فکر کر دینا ہے تاکہ وہ اطمینان سے بلند مقاصد زندگی کے لئے جد وجہد کر سکیں۔ وہ تمام افراد کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ "ہم خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری لیتے ہیں"۔ اس کا نام اسلام کا عدل عمرانی ہے۔ اس مقصد کے لئے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے نام اپنے خط میں لکھا تھا۔

مسلمانوں کے افلاس کا علاج

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا مستقبل اس سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دور حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اُس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ شروع میں تھا۔

تشکیل پاکستان کے بعد جب مملکت نے اپنا (اسٹیٹ) بینک کھولا تو جولائی ۱۹۴۸ء میں اس کے افتتاح کی تقریب، قائداعظم کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے جو تقریر فرمائی (اور میرا خیال ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں کہا کہ۔

ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے۔ جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو سے

تباہیوں سے بچائے گا اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

لیکن ظاہر ہے کہ جاگیرداری۔ زمینداری اور سرمایہ داری کی موجودگی میں، اسلام کا یہ معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ملک کے بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن قائداعظمؒ انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہو گی؟ انہوں نے تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے سنہ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں برملا اعلان کیا کہ

زمینداری اور سرمایہ داری

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز، ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں، وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے! اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہو گا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔[1]

قائداعظمؒ پاکستان میں اسلامی نظامِ زندگی متشکل کرنے کی تدابیر پر غور و فکر میں مصروف اور منہمک تھے کہ دیکھنے والے کیا دیکھتے ہیں کہ وہی لوگ جو مسلسل دس برس تک مطالبۂ پاکستان کی اس شدت سے مخالفت کرتے رہے تھے، فوج در فوج پاکستان کی طرف امنڈے چلے آ رہے ہیں۔ چشمِ عبرت حیران تھی کہ یہ حضرات اب کس منہ سے ادھر آ رہے ہیں۔ خود قائداعظمؒ

مخالفینِ پاکستان، پاکستان کی طرف

بھی تعجب انگیز نگاہوں سے اس ریلے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی ان کی مخالفت کی آگ، ان کی دشنام طرازیوں کی بوچھار۔ ان کے طنز اور استہزاء کے تیروں کی بارش، ایک ایک کر کے پردۂ سیمیں کی طرح ان کی نگاہوں کے سامنے آ رہی تھی۔ دنیا منتظر تھی کہ اب دیکھیں قائداعظمؒ کی طرف سے ان کے تیر دستان کا کیا جواب ملتا ہے۔ وہ

---

[1] میں نے ان حقائق کو دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء میں قائداعظمؒ کے یومِ پیدائش کے سلسلے میں اپنی تقریر میں بھی پیش کیا تھا۔ میرے خیال میں انہیں بار بار سامنے لانے کی ضرورت ہے کیونکہ قوم انہیں بھلا چکی ہے۔

پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ وہ جس پر چاہتے یہاں کا دروازہ بند کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک بلند سیرت انسان کی طرح دل کی پوری کشاد سے کام لیا اور جس طرح نبی اکرمؐ نے مخالفین مکہ سے، جو فتح مکہ کے بعد پا بجولاں سامنے کھڑے تھے، فرمایا تھا ہاتھ کی پوری جنبش سے کہہ دیا کہ

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ

آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا (۳/۹۶) جو یہاں آئے گا

وُسعتِ ظرف

اسے امن حاصل ہوگا۔ انہوں نے اس وسعتِ ظرف کا ثبوت دیا اگرچہ بعض کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی یہ کشادہ نگہی پاکستان کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہو گی۔ جو لوگ ابھی، وا ہگہ سے اس پار تک، پاکستان اور بانیٔ پاکستان کو مسلسل گالیاں دے رہے تھے، وہ اس حد کو پار کرنے کے ساتھ ہی کس طرح پاکستان کے بہی خواہ ہو سکتے ہیں۔ ایسا کہنے والوں کے سامنے قرآن کریم کا وہ فیصلہ بھی تھا جو اس نے اَن اَعراب (قبائلی بدوؤں) کے سلسلے میں دیا تھا جو عمر بھر اسلامی نظام کی مخالفت کرتے رہے تھے لیکن جب اسلام کا غلبہ ہو گیا تو وہ اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے اور اپنا شمار مومنین کی صف میں کرنے لگے۔ اس پر قرآن نے کہا تھا کہ

قَالَتِ الْاَعْرَابُ آمَنَّا۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا۔ وَلَمَّا
يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ .... (۴۹/۱۴)

یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تم صرف غلبۂ اسلام کے سامنے جھک گئے ہو۔ ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔

بعد کے واقعات نے بتا دیا ——— اور اب تک بتاتے چلے آ رہے ہیں کہ جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی، ان کے دل میں فی الواقعہ پاکستان کی محبت جاگزیں نہیں ہوئی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ——— کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو۔ یہاں رہنے میں انہیں اپنے مفاد نظر آتے ہیں، اس لئے وہ پاکستانی ہیں۔ اس کے خلاف انتقام کی چنگاریاں اب بھی ان کے سینوں میں سلگ رہی ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (۳/۱۱۷) اس بغض و عداوت کے مظاہرے کبھی کبھی ان کی زبان سے ہو جاتے ہیں لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظمؒ کو مذہبیین کے اس طائفہ کے عزائم کا علم و احساس تھا، اس لئے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مستقبل میں ان کی آئینی پوزیشن کیا ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کیا جس میں کہا تھا کہ

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین

تھیاکریسی نہیں ہوگی

کی آخری منزل کیسی ہوگی؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔

لیکن قوم کی بدقسمتی (اور ان حضرات کی خوش بختی) کہ "قائدِ اعظم" آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے اور ان کے بعد کوئی ایسا نہ رہا جو انہیں ان کی حدود کے اندر رکھتا۔ چنانچہ یہ کھل کر میدان میں آ گئے۔ آپ کو یاد ہے کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے دوران میں کہا تھا کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں یہ بات آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔

جھٹ بدل گئے

اب انہی مودودی صاحب نے پاکستان کے عوام سے کہنا شروع کر دیا کہ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جد و جہد میں جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہو اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لیڈروں کے ذہن میں خواہ کچھ بھی ہو، کم از کم زبانوں سے انہوں نے ہر اسٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پر یقین کر کے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

(دستوری سفارشات پر تنقید ص۷)

یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہ حضرات یومِ تشکیلِ پاکستان تک، پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت میں کس طرح ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے۔ لیکن اب بلا جھجک کہنا شروع کر دیا کہ

ہم نے پاکستان حاصل کیا

ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے کوشش کی تو اس لئے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود قائم رہے بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو

اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے۔ بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مسلمان باقی رہیں یا نہ رہیں

آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے یہ مربی و محسن، جو یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے اس قدر کوشش کی تھی"، کون بزرگوار ہیں! یہ وہی حضرات ہیں جو تحریک پاکستان کے دوران میں اعلانیہ کہہ رہے تھے کہ

اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟

(سیاسی کشمکش بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ صفحہ ۴۱۵ مطبوعہ ترجمان القرآن)

یہ ہیں وہ جو آج دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کے قومی وجود کا تحفظ کیا تھا! باقی رہا ان کا یہ دعوے کہ انہوں نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

ان احسانات کا صلہ!

اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ حضرات اپنے احسانات کا بدلہ قوم سے کیا مانگتے ہیں۔ یہ کہ پاکستان کا اقتدار ان کے سپرد کر دو تاکہ یہ اس میں اپنی مرضی کے مطابق "اسلامی نظام" قائم کر سکیں۔ اس "اسلامی نظام" میں قوم کا حشر کیا ہوگا۔ یہ بھی سنتے جائیے۔ مودودی صاحب اپنے رسالہ "مرتد کی سزا" صفحہ ۸ میں لکھتے ہیں۔

چنگیزی اسلام

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیدیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام میں انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اور ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ فلاں شخص نے دائرۂ اسلام سے قدم باہر رکھ دیا ہے یہی حضرات کریں گے!

سو برادران! آپ کو جو کچھ کھانا پینا ہو، کھا پی لیجئے، قبل اس کے کہ یہاں ان حضرات کا لایا ہوا اسلامی نظام

قائم ہو جائے۔ اس کے بعد تو یہاں کسی کی جان بچتی دکھائی نہیں دیتی۔

یہ ہے برادران! وہ پاکستان جو سر سیدؒ کے اخلاص و جہاد، اقبالؒ کی آہِ سحرگاہی و نالۂ نیم شبی اور جناحؒ کی بصیرت و کردار سے قریب اسی سال کی محنتِ شاقہ سے تعمیر ہوا اور یہ ہیں وہ لوگ جو آج اس کے دعویدار ہیں۔ وہ لوگ جو قوم کے ان غمگساروں اور محسنوں کو کافر بناتے اور گالیاں دیتے رہے اور جنہوں نے پاکستان کی مخالفت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کس قدر دُور رس تھی نگاہ اُس مردِ قلندر کی جب اس نے کہا تھا کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

مایوسی کی کوئی بات نہیں

لیکن اس میں، عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مشیت نے جس پروگرام نے سر سیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ جیسی شخصیتوں کو ایک دوسرے کے تسلسل میں پیدا کر دیا تاکہ وہ اس قوم کو جسے اغیار کی ریشہ دوانیاں اور اپنوں کی غداریاں، مٹا دینے یا تنور بنا دینے کا تہیہ کر چکی تھیں، ایک عظیم مملکت کا وارث بنا دے، وہی پروگرام اب یہ انتظام بھی کرے گا کہ یہ متاعِ ملی ہر رہزن کی دستبرد سے محفوظ رہے۔ اب پھر ایک سیمرغ پیدا ہوگا جو اپنی شعلہ نوائی سے، اس نشید جانفزا کو فضائے کائنات میں عام کر دے گا کہ باطل کی قوتیں سرنگوں ہوں گی اور اس خطۂ پاک میں ایک بار پھر وہی قرآنی نظام جلوہ بار ہوگا جو چودہ سو سال پہلے سرزمین حجاز میں وجہِ بالیدگی شرفِ انسانیت ہوا تھا۔ اور جس نے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کی ہر اس زنجیر کو توڑ کر رکھ دیا تھا جس میں نوعِ انسان صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ سر سیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ کی بے صوت صدائیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ۔۔۔ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود ۔۔۔ پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی، آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ولو کرہ المشرکون۔

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ اس خطۂ زمین کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ اگر (خدانخواستہ) یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو اسلامی مملکت قائم کہاں ہوگی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس مقصد کو عام کیا جائے جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ جس قدر یہ خیال عام ہوگا اسی قدر اس مقصد کے حصول کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ والسلام۔

قلب و نگاہ کیلئے بصیرت قرآنی کی دعوتِ انقلاب

مفکرِ قرآن جناب پرویز صاحب کی مطبوعاتِ ذیل کا مطالعہ فرمایئے

سلیم کے نام خطوط

نوجوانانِ ملت کی مضطرب آرزوؤں اور اُمنگوں کی منزل متعین کیا ہے؟ ان کے سینوں میں اُبھرتے ہوئے پیچ و تاب کا صحیح حل کیا ہو؟ اس قسم کے تمام اہم سوالات کا جواب آپ کو سلیم کے نام خطوط میں ملیگا، جو مفکرِ قرآن نے ملتِ اسلامیہ کی اُبھرتی ہوئی نئی نسل کے لیے قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں ترتیب دیئے ہیں۔ اور جو تین خوبصورت جلدوں پر مشتمل ہیں۔ قیمت جلد اول ۳ روپے، جلد دوم ۲ روپے، سوم ۳ روپے۔

طاہرہ کے نام خطوط

سلیم بیٹوں کے علاوہ مفکرِ قرآن نے اپنی ملت کی طاہرہ بیٹیوں کو بھی ان کا حقیقی مقام و منصب اور ذمہ داریاں یاد دلائی ہیں۔ یہ خطوط ہر طاہرہ بیٹی کے لیے بجا طور پر شمعِ ہدایت اور نشانِ منزل کا کام دیتے ہیں۔ قیمت جلد اول ۳ روپے، جلد دوم ڈھائی روپے۔

انسان نے کیا سوچا؟

افلاطون اور ارسطو سے لے کر عصرِ حاضر تک عقلِ انسانی کن کٹھن مرحلوں سے گزری اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ انسان کی ساڑھے تین ہزار سال کی عقلی و فکری کاوشوں کا یہ عبرت آموز تجزیہ پرویز صاحب کے سالہا سال کے صبر آزما مطالعہ و تحقیق کا بیش بہا سرمایہ، عصرِ حاضر کا ایک قابلِ تحسین اور بصیرت افروز کارنامہ ہے جسے بجا طور پر سینکڑوں ضخیم کتابوں کا نچوڑ کہنا چاہیئے۔ قیمت پانچ روپے۔

اسبابِ زوالِ اُمت

مسلمانانِ عالم زوال اور شکست کی موجودہ صورتِ حال سے کیونکر دوچار ہوئے؟ ان کے از سرِ نو اُبھرنے کے لیے قرآن نے کیا راہ تجویز کی ہے؟ تاریخ کے ان سوالات کا جواب آپ کو اسی کتاب میں ہی مل سکے گا۔ قیمت مجلد ۲ روپے۔ سستا ایڈیشن ایک روپیہ

لغات القرآن

چار ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنی الفاظ و معانی کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا جسے پرویز صاحب نے سالہا سال کی جان توڑ سعی و کاوش سے ترتیب دیا۔

قیمت جلد اول - جلد دوم - جلد سوم - پندرہ پندرہ روپے۔ جلد چہارم ۱۲ روپے۔

مفہوم القرآن

لغات القرآن کے بعد قرآن کریم کے مفہوم اور حقائق و معارف کا حقیقت آفریں سلسلہ۔ قیمت پارہ اول ۳ روپے ہر دوسرے پارہ کی قیمت (تیرھویں پارے تک) ۲ روپے۔

ملنے کا پتہ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

حقائق و عبر

ا۔ یہ مذہب نہیں سیاست ہے

عائلی قوانین کی مخالفت میں ملک میں جو طوفان برپا کیا جا رہا ہے، اس سلسلے میں ہم شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس کا جذبۂ محرکہ (عام محاورہ کی زبان میں) "حُبِ علیؓ نہیں، بُغضِ معاویہؓ" ہے۔ جماعتِ اسلامی نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ ملک کی زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر رہیگی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ "مذہب" کو بطور آلۂ کار استعمال کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے عائلی قوانین کو بطور (TEST CASE) اپنے سامنے رکھ لیا ہے جس سے اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ملک میں وہ قانون نہیں چلے گا جسے حکومت مرتب کریگی۔ قانون وہ چلے گا جسے ہم چلانا چاہیں گے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم نے لکھا تھا کہ ملک میں اس وقت بیسیوں قوانین ایسے رائج ہیں جو کھلے ہوئے اسلام کے خلاف جاتے ہیں ـــــ مثلاً زنا سے متعلق 'قانون'۔ ان حضرات نے ان قوانین کے خلاف نہ کبھی طوفان برپا کیا ہے نہ محاذ ہی بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں معاصر الاعتصام نے اپنی ۶ ستمبر کی اشاعت میں ایک بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ اسے اس کی زبان میں سنئے۔ لکھا ہے۔

> یہاں یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ۳۳ سال قبل ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی کے ممبر سید محمد کاظمی نے اسمبلی میں کاظمی بل کے نام سے ایک مسودہ قانون پیش کیا تھا جو قانون سازی کے مراحل طے کرتا ہوا "قانون انفساخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کا مطلب مسلمان عورتوں کے حقوق کا تحفظ تھا۔ اس میں کئی ایسی شقیں تھیں جو فقہ حنفی اور مسلک ائمہ اربعہ کے خلاف تھیں۔ لیکن یہ منظور ہوا اور اس کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ علماء اس کی روشنی میں فتوے صادر کرتے رہے ـــ مگر اس کے خلاف کوئی احتجاج یا مظاہرہ نہ ہوا۔ مثلاً اس ایکٹ میں

کہا گیا ہے کہ اگر لڑکی کی شادی باپ یا کسی دوسرے ولی نے پندرہ سال سے کم عمر میں کر دی ہو اور لڑکی نے ۱۸ سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل اسے مسترد کر دیا ہو تو یہ صحیح ہوگا۔ لیکن ائمہ اربعہ کے نزدیک اگر نابالغ لڑکی کا نکاح باپ نے کر دیا ہو تو لڑکی کو بالغ ہونے پر اس نکاح کے مسترد کر دینے کا حق حاصل نہیں۔ وہ مجبور ہے کہ باپ کے کئے ہوئے نکاح کو قبول کرے۔

غور فرمائیے — ائمہ اربعہ کے فیصلہ کے خلاف یہ ایک ایسی اسمبلی فیصلہ کرتی ہے جس میں مسلمان ہندو، سکھ، پارسی، ہندوستانی، عیسائی اور یورپین ممبر شامل ہیں اور اس کی منظوری ایک انگریز وائسرائے دیتا ہے۔ اس کو تو برداشت کر لیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ نابالغی کی حالت میں جو نکاح کیا گیا ہے اس میں لڑکی کی رضامندی کو کوئی دخل نہیں اور اس نے ساری عمر ایک ایسے خاوند کے ساتھ گزارنی ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتی — معاشرہ بگڑ چکا ہے اور حالات اس کے متقاضی ہیں کہ لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد یہ موقع دیا جائے کہ وہ اس شخص کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہے یا نہیں۔

اس کے علاوہ اس میں کئی اور بھی ایسی دفعات ہیں جو ائمہ کے نزدیک صحیح نہیں — مثلاً ... وہ عورت جس کا خاوند لاپتہ ہو گیا ہے — فقہ حنفی کی رو سے عورت انتظار کرے کہ اس کے خاوند کی عمر نوّے سال تک پہنچ جائے۔

اگرچہ متاخرین فقہاء حنفیہ نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق فیصلہ کیا جائے اور امام مالکؒ کا فیصلہ جو مالکی علماء سے مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ حیلہ ناجزہ میں نقل کیا ہے یہ ہے کہ عورت جس وقت قاضی کے سامنے اپنی درخواست گزارے تو قاضی از خود تحقیق و تفتیش کرے۔ اور اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خاوند واقعی مفقود الخبر ہے تو اس کے بعد عورت چار سال انتظار کرے۔ عدالت میں آنے سے پہلے عورت نے اگر دس سال بھی انتظار کیا ہے تو وہ شمار نہیں کئے جائیں گے لیکن قانون انفساخ نکاح مسلم ایکٹ کہتا ہے کہ

اگر شوہر عرصہ چار سال سے مفقود الخبر ہے تو عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نکاح کی منسوخی کی ڈگری حاصل کرے۔

ظاہر ہے یہ دفعہ بھی نہ فقہ حنفی کے مطابق ہے نہ فقہ مالکیؒ کے اور نہ فقہ شافعیؒ کے۔ مگر اسے بھی وقت کی نزاکت اور عورتوں کی مظلومیت و بےبسی کے پیش نظر برداشت کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں

اور بھی بعض دفعات ائمہ کے خلاف ہیں۔ لیکن اس قانون کو اس وقت بھی برداشت کیا گیا جب کہ جمعیۃ العلمائے ہند پورے ملک میں عروج پر تھی اور آج بھی برداشت کیا جا رہا ہے۔ اس کے خلاف نہ کوئی مہم چلائی گئی اور نہ مظاہرہ کیا گیا۔

آپ نے فرمایا کہ خود عائلی قوانین کے سلسلے میں، ۱۹۳۹ء سے ایک ایسا قانون چلا آ رہا تھا جس کی متعدد دفعات نہ صرف فقہ حنفی بلکہ ائمہ اربعہ کے مسلک کے خلاف تھیں۔ اس قانون کے خلاف نہ تقسیم ہند سے پہلے کوئی آواز اٹھائی گئی۔ نہ تشکیل پاکستان کے بعد۔ بلکہ علماء حضرات اس کے مطابق فتوے بھی دیتے رہے۔ لیکن جب اس قانون کی جگہ حکومت پاکستان نے ایک قانون نافذ کیا ——— جو بہرحال قرآن کریم کے زیادہ قریب ہے ——— اس کے خلاف قیامت برپا کی جا رہی ہے اور طوفان مچایا جا رہا ہے کہ اگر یہ قانون منسوخ نہ ہوا تو پاکستان میں (معاذ اللہ) اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا!

یہ کیا ہے؟ وہی حصول اقتدار کی رسہ کشی۔

ذرا گھر کے اندر جھانکئے!

امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، موجودہ صدارتی نظام کو اس لئے اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں کہ اس میں پریذیڈنٹ، منتخب ارکان اسمبلی کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ اس باب میں اس قدر متشدد ہیں (اور یہ کون سی بات ہے جس میں وہ متشدد نہیں ہوتے!) کہ انہوں نے اگلے دنوں ایک اخباری نمائندہ کے ایک سوال کے جواب میں یہاں تک کہہ دیا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی نامزد کرے گی تو جماعت اسلامی اس کی بھی مخالفت کرے گی کیونکہ یہ پارٹی (کنونشن لیگ) ایک ایسے نظام حکومت کی حامل ہے جو اسلام اور جمہوریت دونوں کی نفی کرتا ہے۔

اس کے برعکس۔

> اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک میں نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔

ہم سردست اس نکتہ پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ یہ (بزعم خویش عصر حاضر میں اسلام کے سب سے بڑے علمبردار) کسی زمانے میں (جب اکثریت قائد اعظمؒ کے ساتھ تھی) کس طرح اکثریت کو "ممیانے والی بکریاں" اور "چڑیا گھر کے

جانور" قرار دیا کرتے تھے۔ ہم اس وقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ صاحب، خود اپنی جماعت کے اندر اکثریت کے فیصلوں کو کیا اہمیت دیتے ہیں اور اپنے آپ کو کس طرح آمر مطلق رکھتے ہیں۔ یہ داستانِ دیدنِ خانہ، (جماعت اسلامی سے الگ ہونے والے حضرات کے ترجمان) المنبر (لائل پور) نے اپنی ۳۱ اگست کی اشاعت میں ان الفاظ میں منکشف کی ہے۔

"۱۹۴۶ء میں امیر جماعت اور مولانا امین احسن اصلاحی کے مابین یہ اختلاف رونما ہوا کہ اگر جماعت کے امیر اور منتخب مجلس شوریٰ کے مابین کسی اہم مسئلہ پر نزاع پیدا ہو جائے اور وہ کسی صورت رفع نہ ہو تو کیا امیر ارکان جماعت کی منتخب کردہ مجلس شوریٰ کے متفقہ فیصلے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے یا نہیں، مولانا اصلاحی صاحب کا موقف یہ تھا کہ منتخب مجلس شوریٰ کے ارکان کو چونکہ ارکان جماعت نے تقریباً انہی صفات کی بنا پر اپنے نمائندے چنا ہے جو صفات امیر جماعت کے لئے ملحوظ رکھی جاتی ہیں اور چونکہ ارکان شوریٰ کی تعداد امیر کے بالمقابل زیادہ ہے اس لئے اجتہادی امور میں امیر پر لازم ہے کہ وہ شوریٰ کی رائے کو تسلیم کرے اور اگر اس کے لئے یہ ممکن نہ ہو تو بجائے اس کے کہ وہ ارکان کی منتخب مجلس شوریٰ کے فیصلے کو مسترد کرے وہ خود اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے۔ اس کے برعکس مولانا مودودی صاحب کی رائے یہ تھی کہ ایسے مواقع پر امیر ارکان شوریٰ کے فیصلے کو مسترد کر سکتا ہے ۔۔۔ ان دونوں حضرات کے مابین یہ اختلاف رائے اس حد تک بڑھا کہ بالآخر مولانا مودودی صاحب نے بحیثیت امیر جماعت ارکانِ جماعت کے نام ایک خط لکھا، جس میں اپنے اور مولانا اصلاحی صاحب کے مابین اس اختلاف کو واضح کیا اور لکھا کہ ارکان جمع ہو کر اس مسئلہ پر غور کریں اگر وہ بھی اس رائے سے متفق ہوں جو مولانا اصلاحی پیش کر رہے ہیں تو مولانا مودودی امارت سے مستعفی ہو جائیں گے کیونکہ وہ اس پالیسی کو قبول کر کے نظم جماعت کو لے کر نہیں چل سکتے۔

ملکی اور جماعتی حالات کے پیش نظر ارکانِ جماعت اس مسئلہ کے لئے غالباً جمع نہ ہو سکے۔ پاکستان میں جماعت کے دستور میں، یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ اور مختلف مراحل میں ایک خاص رفتار سے جماعتی امور میں شورائیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ اور جماعت کے دستور میں بھی شوریٰ کے حقوق کو اہمیت دی گئی ۔۔۔ لیکن جب ارکانِ شوریٰ کی ایک خاص تعداد اور مولانا مودودی صاحب کے مابین جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے عنوان پر شدید اختلاف رائے ہوا تو (۱) مولانا مودودی صاحب نے مرکزی شوریٰ کے چار ارکان کو تحریری حکم دیا کہ وہ شوریٰ کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں، اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوں تو جماعت کے حلقہ وار اجتماعات منعقد کئے جائیں اور ان میں امیر جماعت ارکان جماعت سے کہیں کہ یا تو ان ارکان کو نمائندگی سے محروم کر دیا میرا استعفیٰ منظور کر لو۔

(۲) اچھرہ گوٹھ کے اس اجتماع میں جو شوریٰ کے بعض ارکان اور امیر جماعت کے مابین شدید اختلاف کے فیصلے کے لئے منعقد کیا گیا تھا، امیر جماعت نے منتخب شوریٰ کی موجودگی میں اپنے نامزد کردہ امراء حلقہ کو پالیسی کے

مسئلہ میں زیادہ اہمیت دی۔ ارکان کا ایک خفیہ اجلاس منعقد کر کے اپنی پریشانیاں اور سرکش ارکان شوریٰ کے خلاف شکایات ان کے سامنے رکھیں۔ اور عملاً شوریٰ کو معطل کر دیا۔

(۳) اس اجتماع میں مولانا نے ایک قرارداد ارکان سے منظور کرائی جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ جو ارکان جماعت کی پالیسی سے اختلاف رکھتے ہیں انہیں کسی عہدے کے لئے منتخب نہیں کیا جا سکتا۔

اس قرارداد میں یہ بھی طے کیا گیا کہ یہ ارکان اپنے اختلافات کو کھلے طور پر بیان کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

(۴) اور ان بعد جماعت اسلامی کے اجتماع تیرگڑھ میں امیر جماعت نے اپنی ابتدائی تقریر میں واضح الفاظ میں ارکان شوریٰ سے اپنے دائرہ حقوق کی توسیع کا مطالبہ کیا اور اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا گیا، جس کے نتیجے میں شوریٰ کی حیثیت تقریباً وہی ہو گئی جو موجودہ ملکی نظام میں قومی اسمبلی کی ہے اور امیر جماعت نے پہلے سے زیادہ حقوق حاصل کر لئے۔ (ص ۳۷)

ہم اس پہ اتنا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب نے مملکت پاکستان کے لئے جو دستوری خاکہ مرتب فرمایا تھا اس میں امیر مملکت اور اس کی مجلس شوریٰ کے باہمی تعلق کے سلسلے میں یہ کہا تھا کہ

امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔

تشریح۔ امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔

اور امیر کو یہ حق بھی ہوگا کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

(دو دستوری خاکے ص ۳۰-۲۹ مرتبہ نعیم صدیقی صاحب)

اُس وقت یہ اسلام تھا۔ آج وہ اسلام ہے!

ہمیں مودودی صاحب پر افسوس نہیں۔ اسلئے کہ وہ ایک سیاسی لیڈر ہیں جو اپنی کامیابی کے لئے ہر حربہ جائز سمجھتے ہیں۔ افسوس آتا ہے ان کے ان حواریوں پر جو محض روٹی کی خاطر ان کی ہر بات کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ یہ عین اسلام ہے۔ کیا انہوں نے کبھی اتنا نہیں سوچا کہ وہ جو اس طرح لاکھوں سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں تو اس کا کتنا بڑا بوجھ ان کی گردن پر ہے اور وہ خدا کے حضور اس کا کیا جواب دیں گے!

۳- اکثریت کی حکومت

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک اکثریت کے فیصلوں کا نظریہ اس قدر عین اسلام ہے کہ اگر کوئی ہندو بھی اس نظریہ کی حمایت کرے تو اسے بھی مودودی صاحب کی تائید حاصل ہوگی۔

مودودی صاحب تحریک پاکستان کی شدید ترین مخالفت کرتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ (علاوہ دیگر دلائل)

ملک کی اس قدر عظیم اکثریت مطالبۂ پاکستان کی حمایت کر رہی ہے تو اس کے جواب میں وہ کیا فرمایا کرتے تھے۔ غور سے سنئے۔ ان کا ارشاد تھا۔

یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت سے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(سیاسی کشمکش۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ ص۲۷)

آج وہی مسلمان ہیں اور ان کی اکثریت کو اس درجہ عین اسلام قرار دیا جا رہا ہے کہ اگر ایک ہندو بھی اس نظریہ کی حمایت کرے تو (اس نظریہ کے خلاف رائے رکھنے والے فرشتے کے مقابلہ میں) اس ہندو کو، مودودی صاحب کی تائید حاصل ہوگی۔ نہیں! بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ آج "اکثریت کے نظریہ" سے مراد پاکستان کی تمام آبادی کی اکثریت کا نظریہ ہے جس میں، کروروں کی تعداد میں غیر مسلم بھی شامل ہیں اور مودودی نے کہہ دیا ہے کہ ہم اس وقت مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا سوال اٹھا کر آئندہ انتخابات کے راستے میں روڑے نہیں اٹکانا چاہتے۔ یعنی اس وقت خالص مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت بھی غیر اسلامی (کیونکہ وہ اکثریت، قائدِ اعظمؒ کے ساتھ تھی) اور اب مسلم و غیر مسلم آبادی کی مشترکہ اکثریت بھی عین اسلام (کیونکہ اب توقع کی جاتی ہے کہ پراپیگنڈہ کے زور پر، اکثریت کے ووٹ حاصل کئے جا سکتے ہیں)۔ یا للعجب! اسلام کے ساتھ ایسا مذاق بھی شاید ہی اس سے پہلے کبھی ہوا ہو!

۴۔ عورتوں کے حقوق

آپ کسی قسم کی مجلس میں جائیے۔ آپ کو گلے کے پورے زور کے ساتھ یہ آواز نکلتی سنائی دے گی کہ اسلام سے پہلے عورتوں کو کوئی حقوق حاصل نہیں تھے اسلام نے آکر انہیں وہ حقوق دئے جو آج بھی عورت کو دنیا کی کسی قوم میں حاصل نہیں۔

ہمارے نزدیک یہی ایک بات ہے جسے ہم دنیا کے سامنے بڑے فخر سے پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اب اس دعوے کا ثبوت بھی سن لیجئے۔

"سکھر میں مولانا غلام غوث ہزاروی نے صحافیوں سے گفتگو کے دوران کہا کہ میں خواتین کو رائے دہی اور اس کے ساتھ ہر قسم کے سیاسی حقوق دینے کے خلاف ہوں، خواہ وہ بنیادی جمہوریتوں، صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی ممبری ہو یا وزارت یا دیگر عوامی ذمہ داری کے دفاتر میں تقرری ہو۔

عورتوں کے بارے میں، مغرب نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ سراپا مکر اور فریب پر مبنی ہے۔ بظاہر تو عورت کو یہ جھکمہ دیا گیا کہ اسے اس کے غصب شدہ حقوق دئے جا رہے ہیں اور ایسے مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں کہ عورت، مرد سے شانہ بشانہ چل سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکال کر دفتر، اسمبلی ہی نہیں، مل اور کارخانے میں مزدور بھی بنا ڈالا گیا اور اس کا یہ حق تلف کر دیا گیا کہ اس کے مصارف کی ذمہ داری مرد پر ہے۔

یورپ کے احمقوں کے یہ اقدامات تو غلط اور مضر ہونے کے باوجود تعجب کا باعث نہیں تھے کہ ان بے چاروں کے ہاں کوئی ایسی راہ نمائی ہی موجود نہیں ہے جو انہیں زندگی کے ہر شعبے میں فلاح و کامرانی کے راستے پر لے چلے لیکن حیرت کا باعث ہے کہ مسلمانوں نے جہاں مغربیت زدگی میں اور بہت سی جہالت کی باتیں اپنا لی ہیں، وہاں انہوں نے عورتوں کو بھی انتخابی اکھاڑوں اور دفتری کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، درانحالیکہ اب اسلام نے اس امت کی تمام عورتوں سے فرمایا تھا۔ وقرن فی بیوتکن "تم عزت و وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں رہو" قرآن و سنت کی واضح ہدایات کے تحت عورت کا اصل مرکزِ کار، گھر ہے، دفتر، ہسپتال (بحیثیت نرس) ہوائی جہاز (بحیثیت ایئر ہوسٹس) اسمبلی و پارلیمان اور انتخابی ہنگاموں میں اسے رسوا کرنا، اس کی انتہائی توہین اور اس کی فطرت سے سنگین مذاق ہے، علاوہ بریں یہ بات بھی حماقت سے کم نہیں کہ عورت کو سیاسیات میں اس بنا پر گھسیٹا جائے کہ وہ اپنے طبقہ کے مخصوص مسائل اور اپنے حقوق کی نگہداشت کرے گی ــ کیا اسمبلیوں میں جانے والی عورتوں کے خاوند، بھائی اور باپ اتنے کم ظرف، بے حمیت اور سفاک ہو گئے ہیں کہ اپنی بیویوں، بیٹیوں، اور بہنوں کے حقوق کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے؟

ہمیں افسوس ہے کہ اس دور کے علمائے اس اہم مسئلے پر نہ صرف یہ کہ غور نہیں کیا بلکہ ان میں سے کئی ایک اس فتنے کا شکار ہو کر رہ گئے جو اہلِ مغرب نے بپا کیا تھا۔ ضرورت ہے کہ علمائے حق اس مسئلہ پر سوچیں اور اس قطعی غیر اسلامی فکر و اقدام کی اصلاح کے لئے کوشاں ہوں۔" (المنبر، ۱۳ستمبر ۱۹۶۳ء)

یہ ہیں وہ "حقوق" جو (ان حضرات کے مسلک کے مطابق) اسلام نے عورتوں کو دئے ہیں اور جنہیں یہ نہایت فخر سے غیر مسلموں کے سامنے پیش کرتے ہیں!

انگلستان میں آبادی کا تناسب یہ ہے کہ ایک مرد کے مقابلہ میں وہاں چار عورتیں ہیں۔ وہاں جا کر ہمیں یہ اسلام پیش کرنا چاہیئے جس کی رو سے اس ملک کی ۸۰ فیصد آبادی کو گھروں میں بند کر دیا جائے اور ہمیں فیصد

آبادی سے کہا جائے کہ وہ سارے ملک کا کاروبار بھی چلائے اور اسّی فیصد (بیکار) آبادی کی ضروریات زندگی کا کفیل بھی ہو۔ اگر وہ اس اسلام کو قبول کرلے تو کس قدر مزے کی بات ہو کیونکہ وہ اس طرح دس بیس سال میں اسی مقام پر آجائے جس مقام پر مسلمانوں کے ممالک ہیں۔ غیر مسلموں سے انتقام لینے کا یہ طریق کس قدر خوب ہے!

اگر ہم وہاں نہیں جاسکتے تو اس اسلام کو ہمیں کم از کم اپنے دیہات میں ہی نافذ کرنا چاہیئے جہاں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ باہر کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور اس طرح اپنے مصارف کی ذمہ داری تنہا مردوں پر نہیں ڈالتیں۔ ایسا اسلام نافذ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ جو ہماری قوم ابھی تک سانس لے رہی ہے کتنی جلدی قبرستان میں پہنچ جاتی ہے۔

نیز اس اسلام کو رائج کرنے کے لئے کوئی روایت بھی وضع کیجئے جو قرآن کی اس آیت کو منسوخ کردے جس میں کہا گیا ہے کہ

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (۴/۳۲)

جو کمائی مرد کریں وہ ان کا حصہ ہے۔ جو کمائی عورتیں کریں وہ ان کا حصہ ہے۔

اس لئے کہ جب عورتوں کا مقام ہی گھر کے اندر ہے تو پھر ان کے لئے کمائی کے مواقع کہاں ہوں گے؟

اور اگر "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ" کے معنی یہ ہیں کہ عورتوں کو پابند مسکن رہنا چاہیئے۔ باہر نکلنا ہی نہیں چاہیئے تو پھر اس آیت کا کیا ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ جو عورتیں بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ (۴/۱۵) انہیں گھروں میں بند رکھو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچنے کی بات ہوگی کہ نبی اکرمؐ کی ازواج مطہراتؓ اور دوسری عورتیں میدان جنگ میں جاکر جو مرہم پٹی کیا کرتی تھیں ان کے متعلق کیا کہا جائے گا (کیونکہ نرسنگ کا کام تو عورتوں کیلئے جائز نہیں) اور حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جس قدر سیاست میں حصہ لیا، حتیٰ کہ صحابہؓ کی ایک جماعت کی لیڈر ہی آپ تھیں تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا کیونکہ یہ حضرات (جو اس اسلام کے داعی ہیں) ان روایات سے تو انکار نہیں کرسکتے!

باقی رہا یہ کہ "اسمبلیوں میں جانیوالی عورتوں کے خاوند، بھائی اور باپ اتنے کم ظرف، بے حمیت اور سفاک ہوگئے ہیں کہ اپنی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کے حقوق کی حفاظت بھی نہیں کرسکتے"؟

تو اس کا جواب ان لاتعداد مظلوم عورتوں سے مانگئے جو مردوں کے بے پناہ مظالم کے ہاتھوں ساری عمر سسکیاں لیتی موت کی ہچکیوں میں مبتلا رہتی ہیں اور دنیا میں کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا حتیٰ کہ جب وہ (مولوی صاحبان کے تصور کے پیدا کردہ) خدا سے بھی فریاد کرتی ہیں تو وہاں سے جواب ملتا ہے کہ ہم نے تم پر خاوند کی اطاعت فرض کردی ہے اس لئے تمہیں ان کے خلاف شکایت کا حق حاصل نہیں! لیکن قرآن نازل کرنے والے خدا نے تو اس عورت کا بھی ذکر کیا ہے جو رسول خدا کے پاس آکر اپنے خاوند کی شکایت کرتی تھی جو اس وقت مملکت اسلامی کے صدر اعظم تھے۔ اسے تو حضورؐ نے یہ کہہ کر نہیں لوٹا دیا تھا کہ تمہارے بھائی اور باپ کو کیا ہوگیا ہے جو تمہارے حقوق کی حفاظت نہیں کرسکتے اور تم خود اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے گھر سے باہر آگئی ہو۔

بابُ المراسلات

قانونِ وصیت

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے ستمبر کے طلوعِ اسلام میں قانونِ وصیت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جائداد کے متعلق جس کی وصیت چاہے کر جائے۔ کیا اس سے اس کے وارثوں کا حق غصب نہیں ہو جاتا۔ یہ اُن پر صریح ظلم ہے جس کی اجازت اسلام نہیں دے سکتا۔

طلوعِ اسلام - قانونِ وصیت کے سلسلہ میں ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا تھا۔ صرف قرآن کریم کا حکم نقل کیا تھا جس میں اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ اپنے ترکہ کے لئے وصیت کرنا ہر مسلمان پر خدا کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے۔ (سورہ بقرہ۔ آیت: ۱۸۰) اور یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ترکہ کے اتنے حصے سے زیادہ وصیت نہیں کی جاسکتی' نہ ہی یہ کہ یہ وصیت وارثوں کے لئے نہیں کی جاسکتی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ترکہ کے لئے وصیت کرنا ظلم ہے تو آپ سوچئے کہ اس اعتراض کی زد کس پر جا کر پڑتی ہے؟

آپ نے اس اعتراض کی بنیاد غلط مفروضہ پر رکھی ہے۔ اور وہ غلط مفروضہ یہ ہے کہ کسی شخص کی املاک میں' اس کے وارثوں کا حق ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنی ملکیت پر پورا پورا حق ہوتا ہے اور اس کے وارث' اس میں سے' بطور حق کے' کچھ بھی طلب نہیں کر سکتے۔ بات یوں سمجھ میں آجائے گی۔ مثلاً۔

(۱) ایک شخص اپنی کمائی ساری کی ساری خرچ کر ڈالتا ہے۔ اس میں سے کچھ بچاتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہونے والے وارث یہ کہہ کر اسے اس سے نہیں روک سکتے کہ تم ہمارا حق غصب کر رہے ہو جو اپنی ساری کمائی خود ہی خرچ کر ڈالتے ہو۔ ہمارے لئے بچا کر کچھ بھی نہیں رکھتے۔

(۲) ایک شخص اپنی زندگی میں اپنی ساری جائداد' اپنی صوابدید کے مطابق کسی کو دے دیتا ہے اس کے وارث

یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ ان کا حق مار کر دوسروں کو کیوں دے رہا ہے!

اب ظاہر ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی میں ایسا کر سکتا ہے تو اس بات کی وصیت کیوں نہیں کر سکتا کہ اس کے مرنے کے بعد، اس کی جائداد کی یوں تقسیم ہوگی؟ قرآن کریم نے وارثوں کے جو حصے مقرر کئے ہیں ان کے ضمن میں بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد اگر کچھ باقی بچے، تو یہ تقسیم اس صورت میں ہوگی۔ لہٰذا وارثوں کا یہ کہنا کہ چونکہ قرآن نے ہمارے حصے مقرر کر دئے ہیں، اس لئے متوفی کی وصیت کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ اس سے ہماری حق تلفی ہوتی ہے، بے بنیاد دعوے اور قرآن کے خلاف مطالبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وصیت کو ایک تہائی تک مقید کرتے ہیں اور اسے صرف غیر وارثوں کے لئے جائز سمجھتے ہیں، وہ وصیت کے متعلق قرآن کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن کی اس آیت کی موجودگی میں، کسی کے حق وصیت پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

آپ ذرا عملی زندگی کی طرف آیئے اور غور کیجئے کہ اس میں کس کس قسم کی مشکلیں سامنے آتی ہیں۔ ایک شخص کے بھائی ہیں جو ساری عمر اس سے مقدمہ بازی کرتے رہے ہیں۔ وہ اس کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے ہیں۔ اس کی بیوی کے ساتھ بھی ان کی مخالفت کی یہی کیفیت ہے۔ وہ اس احساس کے ماتحت کہ اس کے بھائی، اس کے مرنے کے بعد، اس کی بیوہ کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں گے (کیونکہ اس کی اولاد کوئی نہیں اور وہ بے چاری لاوارث رہ جائے گی) اپنی جائداد کی وصیت اس کے نام پر کر جاتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ بھائی دندناتے ہوئے آ جاتے ہیں اور متوفی کے ترکہ میں اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے موجودہ قانون شریعت کی رو سے (جو سراسر قرآن کے خلاف ہے) اس کی وصیت کالعدم قرار دے دی جاتی ہے۔ اور وہ اس کے عمر بھر کے دشمن، اس کی جائداد سے اپنا حق لے جاتے ہیں۔ کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اس شخص نے جو وصیت کی تھی اس سے ان بھائیوں کی حق تلفی ہوتی تھی اور اب جو کچھ وہ لے گئے ہیں وہ بالکل جائز اور "حق بحق دار رسید" کے اصول کے مطابق ہے؟

یا ایک شخص اپنی اولاد کو روزگار پر لگا کر اپنے ترکہ کو منفعت عامہ کے لئے دے جاتا ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد، اس کی اولاد راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے کہ وہ ایک تہائی سے زیادہ کے لئے وصیت نہیں کر سکتا تھا۔ ترکہ کا وہ تہائی ہمارا حق ہے۔ وہ ہمیں ملنا چاہیئے۔

یہ تمام دعاوی اس غلط مفروضہ کے پیدا کردہ ہیں کہ ایک شخص کی املاک میں اس کے رشتہ داروں کا حق ہوتا ہے۔ قرآن اس حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ جب والدین یا دیگر اقربا کی مدد کرنے کی تائید کرتا ہے تو اسے احسان کہتا ہے۔ ان کا حق نہیں کہتا (وبالوالدین احسانا وبذی القربیٰ)۔ اور ظاہر ہے کہ وہ جب کسی کی

زندگی میں کسی کو اس کے مال کا حقدار قرار نہیں دیتا تو یہ کس طرح روا ہو گا کہ اس کی موت کے بعد، یہ لوگ اس کے حقِ وصیت کو برطرف کرتے ہوئے، اس کے ترکہ کا بطور اپنے حق کے مطالبہ کریں۔ ہاں! اگر وہ وصیت نہیں کرتا۔ یا اس کی وصیت کے بعد کچھ باقی بچ جاتا ہے، تو اس کے حقدار یہ لوگ ضرور ہو جائیں گے کیونکہ جو اس کا مالک تھا اس نے (وصیت نہ کرنے کی وجہ سے) اپنے حق کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اور ایسی شکل میں قرآن نے ان لوگوں کے حصے مقرر کر دیئے تھے۔

قرآن کی رو سے مسلمان کے مال میں حق صرف محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہے۔ (رشتہ داروں کا محض رشتہ دار ہونے کی بنا پر حق نہیں ہے)۔ اس کا ارشاد ہے کہ

فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ——— (۷۰/۲۴-۲۵) "ان کے مال میں ان لوگوں کا حق ہے اور حق بھی ایسا جس کا ہر ایک کو علم ہے۔ جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں یا جو کمانے سے یکسر معذور ہو چکے ہیں اور اس طرح وہ ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جاتے ہیں"۔ (ظاہر ہے کہ جب ان ضرورت مندوں کی ضروریات کو انفرادی طور پر پورا کیا جائے گا تو اس کی ابتدا ہر شخص کے قریبی دائرے سے ہو گی)۔ اگر اس کی وصیت سے کسی ایسے شخص کی حق تلفی ہوتی ہے، تو قرآن نے اس کی گنجائش رکھی ہے کہ مناسب طریق سے (جسے معاشرہ طے کرے) اس کا ازالہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جس آیت میں وصیت کا حکم دیا گیا ہے اس سے آگے ہے کہ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ... (۲/۱۸۲)۔ "اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ وہ کسی کی طرف جھک گیا ہے اور اس سے کسی حقدار کی حق تلفی ہوتی ہے، تو اسے چاہیئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ یہ چیز، وصیت بدل دینے کے مترادف نہیں ہو گی جو جرم ہے۔

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ وصیت اور وراثت کے یہ احکام اس دور سے متعلق ہیں جب قرآنی نظامِ معاشرہ اپنی مکمل شکل میں ہنوز قائم نہ ہوا ہو جب وہ نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت نہ تو ذاتی جائدادیں کھڑی کی جائینگی نہ ان کی تقسیم کا سوال پیدا ہو گا ——— جیسے نبی اکرمؐ نے نہ کوئی جائداد چھوڑی، نہ اس کے لئے وصیت کی ضرورت پڑی۔ جو کچھ آپؐ کے مصرف کے لئے تھا، وہ بیت المال کی طرف لوٹ گیا تاکہ وہ دوسرے ضرورت مندوں کے کام آ سکے۔

پرویز صاحب کی مطبوعات دینِ خداوندی کے منشار و مقصود کی ترجمان اور قرآنی حقائق و معارف کی نقیب ہیں۔ ان کے مطالعہ سے حقیقی اسلام کی روشنی حاصل کیجئے۔

رابطۂ باہمی

(بزمہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں۔)

لندن بزم کا ماہانہ اجتماع چغتائی صاحب کے دولت کدہ (20-HOWARD WALK LONDON-N3) پر ہوا۔ طلبار کی بہت بڑی تعداد شریک اجلاس تھی اور بزم کراچی کے ایک پرانے رفیق محترم اے۔ایچ۔ مراد صاحب ونڈسر کیسل (WINDSOR CASTLE) سے تشریف لائے تھے۔ پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب (انسان کے بنیادی حقوق۔ قرآن کریم کی روشنی میں) ٹیپ پر سنایا گیا۔

بزم کے روح رواں محترم چغتائی صاحب کے فرزند ارجمند کی شادی خانہ آبادی کی پرمسرت تقریب پر بھی بزم کے احباب شریک ہوئے اور سب نے بزم کے اس نئے جوڑے کے مستقبل کی شادمانیوں اور خوشگواریوں کے لئے بر خلوص قلب دعا کی۔ محترم دائی۔ایم۔بٹ صاحب HUDDERSFIELD میں سرگرم کار ہیں اور BRADFORD میں محترم دین محمد صاحب کی مساعی جمیلہ سے دعوت قرآنی کی تحریک نشوونما پا رہی ہے۔

ڈھاکہ ۶ ستمبر کو محترم صابری صاحب کے ہاں بزم کا اجلاس ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد پرویز صاحب کے مفہوم القرآن سے شادابی قلب ونگاہ کا سامان کیا گیا۔ اس سے پہلے اتوار کو پرویز صاحب کا اہم خطاب (انسان اور جنگ) فردوش گوش تھا۔ اس اجلاس میں مولانا سراج الاسلام صاحب نے بھی شرکت فرمائی مولانا موصوف تقسیم ہند سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر کے ممتاز عہدیدار رہے ہیں۔ اور اسی دور میں مرحوم لیاقت علی خان کے دولت کدہ پر پرویز صاحب سے متعارف ہوئے تھے۔ وہ بڑے ذوق وشوق سے شریک اجلاس ہوئے اور انتہائی جذب وانہماک میں پرویز صاحب کے خطاب سے لطف اندوز ہوئے۔ انہوں نے تجویز کیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے نوجوانوں کے لئے یہ ٹیپ اگر انگریزی زبان میں ریکارڈ کئے جائیں تو اس سے کہیں بڑھ کر دور رس اور خوش آیند نتائج کے حامل ثابت ہوں گے۔

بزم کے اس اجلاس میں دارالمطالعہ کے قیام کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ سردست عارضی طور پر یہ لائبریری شہاب صاحب کے ہاں قائم کی جا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس مقصد کے لئے موزوں جگہ کی تلاش جاری رہے گی۔ میزان پبلیکیشنز کی ایجنسی کے سلسلے میں پاک کتاب گھر والوں سے معاملہ طے کیا جا رہا ہے۔ دارالمطالعہ کے لئے بھی ضروری کتب یہیں سے خرید کی جائیں گی۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا سلسلہ بڑے کامیاب اور ایمان افزا مراحل طے کر رہا ہے اور محترم حلیم صاحب کے اہم مضامین "مارننگ نیوز"، "پاکستان آبزرور"۔ "ینگ پاکستان" اور "زلوئٹ" میں شائع ہوئے ہیں۔ ان انگریزی اخبارات کے علاوہ "بنگلہ جرائد" "جہاد ملی" وغیرہ اور یونیورسٹی کے رسائل میں بھی محترم موصوف کے رشحاتِ قلم کی اشاعت تسلسل سے جاری ہے۔ آئندہ ہر نشست میں کچھ وقت "حاصل مطالعہ" کے اہم مقصد کے لئے وقف ہوا کرے گا۔ جس میں احباب طلوعِ اسلام کی دعوتِ قرآنی کے متعلق اپنے اپنے حاصل مطالعہ کو حاضرین کے سامنے پیش کیا کریں گے اور یوں اس دعوتِ انقلاب کو سمجھنے سمجھانے کا سلسلہ موثر طور پر آگے بڑھے گا۔

بزم کا آئندہ اجلاس محترم بنی حسن صاحب کے دولت کدہ پر ۱۶/ اکتوبر کو منعقد ہوگا۔

لاہور بزم کے احباب نئے ذوق و شوق اور ولولوں سے سرشار ہو کر شانہ بشانہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگست کے آخری ایام میں انہوں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک عظیم الشان اجتماع کا اہتمام کیا اور اس میں محترم پرویز صاحب نے "اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز خطاب ارشاد فرمایا۔ ۱۱ ستمبر کو قائداعظم کے یوم وفات کی تقریب پر اسی ہال میں مفکر قرآن کے تاریخی خطاب کا اہتمام کیا گیا۔ ہال کے باہر شامیانوں اور کرسیوں کے وسیع انتظامات کئے گئے۔ حاضرین کے والہانہ ذوق و شوق کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اجلاس کے آغاز سے پون گھنٹہ قبل ہی ہال اور شامیانے حاضرین سے کھچا کھچ بھر چکے تھے اور جگہ نہ ملنے کے باعث سینکڑوں شائقین عالمِ مایوسی میں واپس لوٹ رہے تھے۔ دورانِ خطاب میں نصف گھنٹے سے زیادہ بجلی بند رہی۔ لاؤڈ اسپیکر اور پنکھوں نے اپنا کام بند کر دیا لیکن شدتِ گرما و حبس سے پسینے میں شرابور حاضرین پورے جذب و انہماک سے اس تاریخی خطاب کو سنتے رہے جس کا موضوع تھا "پاکستان نے کس نے بنایا؟" (یہ خطاب اسی اشاعت میں شامل ہے) اجلاس میں دارالحکومت کے ممتاز اہلِ علم اور صاحبِ فکر شامل ہوئے اور سب اس علم افروز خطاب پر خراجِ تحسین پیش کرتے رخصت ہوئے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بزم، پرویز صاحب کے آئندہ خطابات کے لئے کسی وسیع ہال یا پھر کسی کھلی جگہ کو کام میں لانے پر غور کر رہی ہے تاکہ جگہ کی تنگی کا ازالہ ہو سکے۔

مردان بزم کا ماہانہ اجلاس عموماً ہر ماہ کے پہلے جمعہ کو ڈاکٹر رضا محمد خان صاحب کے مکان واقع بک گنج بوقت چار بجے شام ہوتا ہے۔ اس طرح گزرے ہوئے مہینے کے تجربات سے متعلقہ امور زیرِ غور لائے جاتے ہیں۔ اور بزم کی سابقہ سرگرمیوں کا جائزہ لے کر آگے قدم بڑھانے کا مرحلہ طے کیا جاتا ہے۔ درسِ قرآن کا سلسلہ ہر شام کو ٹھیک

آنحضرت کے باقاعدگی سے جاری ہے۔ پمفلٹوں کی تقسیم منظم طریق پر ہو رہی ہے اور اس کے نتائج بڑے خوش آیند ہیں۔ کیونکہ صاحب علم و فکر طبقہ میں ان پمفلٹوں کو پسند کیا گیا ہے اور اس سے تحریک کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔

ضلع مردان اور بالخصوص مردان کے نواحی خریداران طلوع اسلام سے یہ گزارش ہے کہ وہ بزم سے اپنا رابطہ استوار کرنے کے لئے صد لقیبہ انجنیئرنگ ورکس، شام گنج تیکہ روڈ کی معرفت خان عبدالحکیم خان صاحب نمائندہ بزم سے رابطہ قائم کریں۔

کوئٹہ بزم کے اجتماعات باقاعدگی سے سرانجام پا رہے ہیں۔ حالیہ اجتماع میں "شہنشاہ بوریانشین" کے عنوان سے پرویز صاحب کی اہم تقریر بذریعہ ٹیپ سنائی گئی۔ تحریک کا لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا۔ افہام و تفہیم کی صورت میں شہر کے اہل علم حضرات سے رابطہ قائم ہے۔ اور مخالفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں اور شکوک و شبہات ختم ہو رہے ہیں۔

لاہور چھاؤنی ۳ ستمبر کو بزم کا ماہانہ اجلاس محترم خالد الزماں صاحب کے مکان پر ہوا۔ محترم ظفر عباس قریشی صاحب نے "طلوع اسلام نے کیا دیا" کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دو نئے احباب نے اپنے آپ کو بزم کی رکنیت کے لئے پیش کیا۔ ان کی منظوری کا فیصلہ بزم کے آیندہ اجلاس میں کیا جائیگا۔

بوریوالہ بزم ہر ہفتہ احباب کا اجلاس منعقد کرتی ہے۔ لٹریچر کی تقسیم پورے نظم و ضبط کے ساتھ ہو رہی ہے۔

میانوالی ۱۵ ستمبر کو بزم کا ماہانہ اجلاس محترم عزیز حسین قریشی صاحب کے ہاں ہوا۔ اراکین بزم کے علاوہ دیگر اہل شوق حضرات بھی تشریف لائے۔ سید نصیر شاہ صاحب نے "آخرت" کے موضوع پر حاضرین سے خطاب کیا۔ اور قرآنی تحریک سے متعلق بعض سوالات کے جواب دئے۔ آیندہ اجتماع میں سید نصیر شاہ صاحب "عائلی قوانین" پر خطاب فرمائیں گے۔ اس اجلاس میں خواتین کے لئے بھی معقول انتظام ہوگا۔

کیا آپ کو معلوم ہے؟

کہ طلوع اسلام میں شائع شدہ اشتہارات پاکستان کے علاوہ ۲۲ غیر ممالک کے قارئین کی نظروں سے بھی گزرتے ہیں۔ آپ بھی طلوع اسلام میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

تقاریرِ سیرت — بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے زیرِ اہتمام ۱۱ر اگست کو جشنِ عید میلاد النبیؐ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ ان میں سے دو تقاریر ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہیں اور باقی آئندہ اشاعت میں سامنے آئیں گی۔

تعمیرِ سیرت

(محترم عبد الرب صاحب)

ہم جس بلند و بالا ہستی کا یوم پیدائش منا رہے ہیں، اس نے اگرچہ کہا تھا کہ میں تم جیسا ہی انسان ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپؐ کی ذات انسانیت کے معراج یعنی سب سے بلند مقام پر تھی۔ آپؐ خدا کے بعد سب سے زیادہ بزرگ ہستی تھے۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

حضورؐ کی بلندی اور بزرگی آپ کی سیرت سے تھی۔ چالیس سال کی عمر تک باوجودیکہ لوگوں کی نظر میں اوروں کی طرح آپ بھی اپنے باپ کے بیٹے ہی تھے، مگر سیرت کی بلندی کی بنا پر دنیا آپ کو صادق، سچا اور امین، اور امانت دار کہہ کر پکارتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو نبوت کے لئے چنا اور نبیوں کا جو سلسلہ ہزارہا سال سے چلا آ رہا تھا اسے آپ کی ذات پر ختم کر کے آپ کو خاتم النبیین (نبیوں کا ختم کرنے والا) بنایا اور آپ کے فرائض میں سراجاً منیرا "روشن قندیل بننا بھی شامل کیا۔ یا ایھا النبی انا ارسلنک شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً۔ آپ لوگوں کے نگہبان اور ان کی بھلائی کے خواہاں ہوں گے۔ انہیں اچھے کاموں کے اچھے نتیجہ کی خوش خبری دیں گے اور برے کاموں کے برے نتیجہ سے آگاہ کریں گے، اللہ کی ہدایات کی طرف بلائیں گے اور روشن قندیل بنیں گے۔ تاکہ آپ کی سیرت کی چمک دمک سے دیکھنے والے متاثر ہو کر اپنی سیرت کو بہتر بنانے کی فکر کریں۔

حضورؐ کی سیرت بقول حضرت عائشہؓ قرآن تھی اور اس قول کی صداقت کا خود قرآن مجید گواہ ہے۔ سورۂ انعام میں ہے "اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ" تمہارے پروردگار کی طرف سے جو وحی تم پر کی جاتی ہے اس پر چلو۔ اور "انا اول المسلمین" (میں سب سے پہلا مسلمان ہوں) کہہ کر حضورؐ تمام عمر اسی وحی پر چلتے رہے۔ اس حقیقت کا ذکر قرآن مجید میں بار بار خود حضورؐ کی زبانِ مبارک سے بھی ہوا ہے "ان اتبع الا ما یوحی الی" میں تو صرف اس پر چلتا ہوں

جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ حضورؐ کے اتباعِ وحی کا مضمون سورۂ یونس میں بہت کھول کر بیان ہوا ہے۔ "واذا تتلیٰ علیھم ایاتنا بینٰت" اور جب ہماری واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں "قال الذین لا یرجون لقاءنا" تو جنہیں ہمارے روبرو ہونے کی توقع نہیں ہے کہتے ہیں "ائت بقرآن غیر ھٰذا او بدلہ" اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ۔ یا اسی کو بدل ڈالو۔ "قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقای نفسی" آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس قرآن کو اپنی مرضی سے بدل ڈالوں "ان اتبع الا ما یوحیٰ الی" میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ "انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم" میں تو ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی تو یوم عظیم کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤں۔ اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو ہدایت تھی "فاحکم بینھم بما انزل اللّٰہ ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق" (۴۸/۵) لوگوں کے فیصلے وحی کے مطابق کیجئے اور حق مل جانے کے بعد ان کی خواہشات کی پرواہ نہ کیجئے۔ پھر اصولی طور پر بتا دیا کہ "ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولٰئک ھم الکٰفرون، الظٰلمون، الفٰسقون" (۵/۴۴ - ۴۵/۴۷) جو وحی کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں۔ ظالم ہیں۔ فاسق ہیں۔" یہ تھا حضورؐ کے قرآن پر چلنے کا عالم۔ آپ اس سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ خود قرآن مجید نے اعلان کیا "انک لعلیٰ خلق عظیم" آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ اسی بنا پر ارشادِ خداوندی ہوا۔ "لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ" بے شک تمہارے لئے رسول اللہؐ کی سیرت میں نہایت حسین نمونہ ہے۔

قرآن مجید شروع سے آخر تک تعمیرِ سیرت کی ہدایات سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی تعمیرِ سیرت ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ پہلی نسلوں کے بعد زمین میں تمہیں اس لئے بسایا ہے "لننظر کیف تعملون" ہم دیکھیں کہ تم کیا کچھ کرتے ہو۔ دوسری جگہ ہے "خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا" موت اور زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمہیں حسنِ سیرت پیدا کرنے کا موقع ملے۔

سیرت کی تعمیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ عزم و ارادہ بخشی "ونفخنا فیہ من روحنا" اور اس قوت کے فیصلوں کو پورا کرنے کے لئے ہاتھ، پیر، سمجھ بوجھ والا جسم دیا۔ لیکن انسانی جسم ایسی خودکار (آٹومیٹک) مشین ہے جس کا "مین سوئچ" (MAIN SWITCH) انسانی مرضی کے ہاتھ میں تو ہے مگر اس کے دبائے بغیر بھی وہ کام کرتی رہتی ہے۔ انسانی جسم اندرونی اور بیرونی محرکات کا جواب از خود انسانی مرضی سے پوچھے بغیر دیتا رہتا ہے۔ بھوک یا پیاس لگی اور اس نے کھا پی لیا۔ جہاں فائدہ نظر آیا ادھر خود بخود کھنچ گیا۔ کوئی خطرہ پیش آیا تو اس سے فوراً بچاؤ کیا۔ تکان ہوئی تو سو گیا۔ یہ اور اسی قسم کے کام سب "مین سوئچ" (MAIN SWITCH) دبائے بغیر ہوتے ہیں۔ لیکن جب انسانی مرضی یا ذات جسم کا "مین سوئچ" دبا دیتی ہے تو جسم خودکاری کو ترک اور قوتِ ارادی کے فیصلے کے مطابق کام کرنے لگتا ہے۔ مثلاً بھوک کے معاملہ میں اگرچہ کھانا سامنے رکھا ہے لیکن چونکہ قوتِ ارادی نے روزہ کی وجہ سے فرمان جاری کر دیا ہے کہ سورج چھپے کھانا ہوگا اس لئے

کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھتا۔

لیکن انسانی قوت ارادی یا ذات اپنے فیصلوں میں آزاد ہے اُسے سیاہ و سپید کرنے کا پورا اختیار ہے۔ قرآن مجید میں ہے " فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر " جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔ ذات کا اختیار بجا۔ لیکن اس کے آزادانہ فیصلے خود اس پر بھی گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ اگر فیصلے سختی سے لئے ہوئے ہیں تو ذات میں درشتی آئے گی۔ اگر وہ نرمی سے ہوئے ہیں تو ذات میں لوچ اور ملائمت پیدا ہوگی۔ ایک ہی قسم کے فیصلے ذات کو یک رُخا بنائیں گے۔ مختلف قسم کے فیصلے ذات کو متوازن بنانے میں مدد دیں گے۔ اس لئے انسانی ذات کو تعمیر سیرت کے لئے ایسے نمونہ کی ضرورت ہے جس کی سیرت پورے طور پر متوازن ہو۔ یعنی سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہم میں سے کتنے ہیں جن کی ذات یا مرضی جسم کا " یس سر " رہا ہی اور اس سے اپنے فیصلوں پر عمل کراتی ہے۔ اکثر و بیشتر تو ہمارے جسم خودکار (آٹومیٹک) طریق پر ہی زندگی کے سب کام کیا کرتے ہیں۔ پھر سیرت کی تعمیر کیسے ہو؟ تعمیر سیرت کے لئے پہلے قوت ارادی کا استعمال چاہیئے اور پھر اس کی اپنی ہدایت کے لئے اسوۂ حسنہ رسولؐ۔

قرآن مجید نے تعمیر سیرت کے لئے دو بنیادی باتیں بتائی ہیں:-

۱۔ قرآنی اصولوں کو ہر وقت آنکھوں کے سامنے رکھنا تاکہ زندگی کا ہر کام ان اصولوں کی حدود کے اندر رہ کر کیا جائے۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا عملی مفہوم یہی ہے۔ اور کلمہ کے دہراتے رہنے کی افضلیت بھی اسی سے ہے۔ ادنیٰ تامل سے معلوم ہوگا کہ ایمان کے پہلے چار اجزاء کلمہ میں آجاتے ہیں۔ قرآنی اصولوں پر یقین ہوا تو رسول پر یقین خود بخود ہوا جس نے قرآن دیا۔ اور جب رسول پر یقین ہوا تو جبریلؑ (دیکھئے الملائکہ) پر یقین لازم آیا جس نے قرآن رسولؐ کو پہنچایا اور ملائکہ پر یقین کے معنی ہوئے اللہ پر ایمان جس نے اُن کے ذریعہ قرآن، رسول کو بھیجا اسلئے " آمنت باللہ و ملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ " کا خلاصہ ہوا قرآن پر عملی یقین۔

۲۔ موت کو جسم کی موت سمجھنا اور مرنے کے بعد انسانی ذات کے زندہ رہ کر زندگی کے آئندہ مرحلوں کو طے کرنے پر یقین رکھنا۔ یہ ایمان کا پانچواں جزو یعنی " ایمان بالآخرۃ " ہے۔ اس یقین سے انسانی ذات کا احساس تازہ اور اس کی مضبوطی اور استحکام کی فکر پیدا ہوتی ہے۔ ذات کی نشوونما اگر متوازن طریق پر ہو تو وہ زندگی کے آئندہ مرحلے اطمینان سے طے کرتی ہے۔ ورنہ اس کی حالت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اس زندگی میں لنگڑے۔ لولے، فالج اور کوڑھ وغیرہ کے ماروں کی ہوتی ہے کہ حرکت بہ ہزار دقت کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے بعض پہلو آپ کے سامنے پیش کئے گئے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس تقریب سے ہم کیا فائدہ اٹھائیں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہم مسلمان محض پیدائشی مسلمان ہیں اور مسلمان گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے خود کو مسلمان کہتے اور کہلاتے ہیں۔ ورنہ ساری عمر میں یہ موقع کبھی نہیں آیا کہ ہم ایمان کے

اجزاء اور کلمہ کی اہمیت پر غور کریں اور انہیں سمجھ کر زندگی کی بنیاد بنائیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے امنت باللہ و ملائکتہ وکتبہ ورسلہ کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ایمان لانے والا۔ قرآن مجید کو اللہ کا کلام مانتا ہے اور ایمان بالآخرۃ سے وہ تسلیم کرتا ہے کہ مرنے کے بعد اسے زندگی کے اور مرحلے بھی طے کرنے ہیں۔ اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا عملی مطلب یہ ہے کہ اسے دہرانے والا قرآن مجید کو زندگی میں رہنما بنائے گا۔ چونکہ یہ مطالب پیدائشی مسلمان کے سامنے نہیں آتے اس لئے اسلامی کردار بھی مشکل ہی سے کہیں نظر آتا ہے۔ لیکن پیدائشی مسلمان کو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بے پناہ عقیدت ہے وہ ملت کی بگڑی کو بنانے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حضورؐ کے یوم ولادت کی تقریب سعید کو مناتے ہوئے ہم اپنے آپ سے عہد کریں کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل ہونے کی حیثیت سے ہم قرآنی ہدایات کو معلوم کریں گے اور سمجھیں گے اور انہیں ہر وقت سامنے رکھ کر زندگی کے کام ان کے مطابق کرنے کی کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا ناصر اور مددگار ہو۔

منصبِ رسالت

(محترم عبدالمجید خان صاحب)

آج ہم حضور ختمی مرتبت کا یوم میلاد منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ وقت کی کمی کے باعث مختصراً میں حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کی سیرتِ طیبہ کے چند پہلو جو منصبِ رسالت کے متعلق ہیں پیش کروں گا۔

جہاں تک حضورؐ کے منصبِ رسالت کا تعلق ہے قرآن نے کہا ہے کہ آپ کا فریضہ اولین یہ تھا کہ آپ وحیِ الٰہی کا پہلے خود اتباع کریں اور بعد ازاں تمام نوعِ انسانی کو اس کی طرف دعوت دیں۔ انسانی عقل کا جہاں تک تعلق ہے وہ تمام نوعِ انسان کے لئے ایک ضابطۂ قوانین وضع کرنے سے قاصر ہے سوائے وحی کے۔ اس لئے ارشاد کیا گیا کہ

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○ سورۂ اعراف - آیت ۲۰۳

ان سے کہو کہ (میں کوئی بات اپنی طرف سے وضع نہیں کر سکتا) میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے میرے نشو ونما دینے والے کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ ضابطۂ قوانین تمام دنیا کے انسانوں کے لئے بصائر و دلائل کا مجموعہ ہے اور جو لوگ اس کی صداقت پر ایمان لائیں ان کے لئے ہدایت و رحمت کا سرچشمہ۔

دوسری جگہ کہا گیا کہ اس ضابطۂ قوانین میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا آپ کو اختیار نہیں دیا گیا۔ جزئیات جو آپ نے مرتب کی تھیں وہ قرآن کے اٹل و محکم اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق تھیں۔ آیت ہے

قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآئِ نَفْسِىٓ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَىَّ ۖ إِنِّىٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّى عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (سورۂ یونس آیت نمبر ۱۵)۔

ان سے کہہ دو کہ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی قسم کا ردوبدل کر سکوں۔ میرا مقصد صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے جو میری طرف نازل ہوتی ہے۔ اگر میں اپنے نشوونما دینے والے کے احکام سے سرتابی کروں تو اس کا قانونِ مکافات مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے میں اس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کی سزا بہت سخت ہوا کرتی ہے۔

حضورؐ کا منصب نہ صرف یہ تھا کہ آپ خود اس وحی کا اتباع کرتے بلکہ یہ منصب بھی تھا کہ آپ اس کو تمام انسانوں تک پہنچاتے اور ایک قرآنی معاشرہ قائم کرتے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ پہلے آپ ایک ایسی جماعت تیار کرتے جو اس ضابطۂ قوانین پر عمل پیرا ہو۔ اور ساتھ ہی ان کے قلب و نگاہ میں پاکیزگی پیدا ہو جائے۔ یہ بڑا اہم فریضہ تھا جس کے متعلق ارشاد ہوا۔

لَقَدْ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ ۚ وَإِن كَانُوا۟ مِن قَبْلُ لَفِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ۔ (سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۶۴)

اس ضابطۂ قوانین پر ایمان لانے والوں پر خدا کا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ان کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا۔ وہ رسول ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ انہیں قانون اور اس کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی وہ ان قوانین کی اطاعت اندھا دھند نہیں کراتا۔ ہر بات کو اچھی طرح سمجھا کر ذہن نشین کرا کر علی وجہ البصیرت اطاعت کراتا ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتظام نہ ہوتا تو لوگ اسی طرح حیران و سرگرداں راہ گم کردہ کھوئے ہوئے پھرتے جس طرح اس سے پہلے پھرتے تھے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعتِ مومنین کے ساتھ ایک قرآنی معاشرہ قائم کر لیا تو اس وقت آپ کی حیثیت مرکزِ ملت کی ہو گئی تاکہ اس معاشرہ میں قرآنی حقائق محسوس پیکر اختیار کر جائیں۔ ساتھ ہی آپ جماعت کے نگراں بھی تھے۔ قرآن کا ارشاد ہے

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝ (سورۂ بقر آیت ۱۴۳)۔

اس پروگرام سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ تمہیں ایک ایسی قوم بنا دیا جائے جسے تمام دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو۔

جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلہ پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اور اس کا فریضۂ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی محاسب و نگران ہو۔ (وہ دیکھے کہ کوئی قوم، ظلم و زیادتی پر تو نہیں اتر آئی) اور ان کے اپنے اعمال کا محاسب و نگران ان کا رسول ہو جسے اس نظامِ خداوندی کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

برادرانِ عزیز! ان آیتوں پر غور کرنے سے بات واضح ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضۂ رسالت حسبِ ذیل تھا۔

(۱) خدا کی طرف سے جو وحی آپ پر نازل ہوتی تھی اس کا خود اتباع کرتے اور اسے لوگوں تک پہنچاتے۔

(۲) آپ کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ وحیٔ الٰہی یعنی قرآن کے اٹل قوانین میں کسی قسم کا ردّ و بدل فرماتے جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے وہ آپ صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے متعین فرماتے جیسا کہ قرآن میں ایک جگہ کہا

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔

(۳) ایک ایسی جماعت تیار کرتے جو ان قوانین کو سمجھ کر اس کے مطابق ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں ہر فرد کے قلب و نگاہ میں پاکیزگی پیدا ہو جائے۔

(۴) نظام قائم ہونے کے بعد آپ خود بحیثیت مرکزِ ملت کے اس جماعت کے اعمال کی نگرانی کرتے۔

آخری آیت جو میں نے پڑھی اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حضورؐ کی طبعی زندگی کے اختتام کے بعد بھی اس نظام کو آگے بڑھنا تھا۔ اس لئے اب یہ فریضہ امت کے سپرد ہوا کہ وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو تاکہ دنیا میں جنتی معاشرہ قائم ہو جائے۔ والسلام۔

الفتنۃ الکبریٰ

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں کس فتنۂ عظیم کا دروازہ کھل گیا اس کی غیر جانبدارانہ اور مکمل تفصیل آپ کو مصر کے مشہور عالم اور مؤرخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرہ آفاق کتاب الفتنۃ الکبریٰ میں ملیگی۔ یہ کتاب ادارہ طلوع اسلام کے زیرِ اہتمام اردو میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت ۶ روپے۔

ملنے کا پتہ: میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ (۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور)

بچّوں کا صفحہ

تم بہت بہادر ہو

اسلام صاحب کراچی کے ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ سچ مچ ایک اُستاد تھے۔ بہت سے پڑھانے والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ بس کلاس میں لڑکوں کو سبق دے دیا۔ اور پھر لڑکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اسلام صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اچھی طرح سمجھتے اور جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ حمید کو تقریر کرنے کا شوق تھا۔ اسلام صاحب نے اس کی ہمت بڑھائی اور اُسے بتایا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔ رشید کو تصویریں بنانے سے دلچسپی تھی۔ اسلام صاحب اس کے لئے تصویریں بنانے کی کئی کتابیں لائے۔ سلیم کو شعر یاد کرنے کا شوق تھا۔ اسلام صاحب نے ایک کاپی پر اُسے بہت اچھے اچھے شعر لکھ کر دئے۔ ایسے شعر جن سے آدمی کو اچھے اچھے سبق حاصل ہوں۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ ہر اسکول میں اچھے لڑکے بھی ہوتے ہیں اور بُرے لڑکے بھی۔ بہت سے استاد بُرے لڑکوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی بُرائی کرتے تھے۔ مگر اسلام صاحب ایسے لڑکوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ وہ کسی سے نفرت کرنا تو جانتے ہی نہ

تھے۔ اپنے ساتھیوں سے وہ اکثر کہتے تھے کہ "تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ بڑوں کو اچھا بنایا جائے۔ یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے۔ مدتوں میں اس محنت کا پھل ملتا ہے"۔

چھٹی جماعت میں ایک لڑکا تھا۔ فیروز اس کا نام تھا۔ وہ ہمیشہ سب سے کڑوا بول بولتا۔ نرمی سے بات کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اپنی کلاس کے کسی لڑکے سے سڑک پر اس کی لڑائی ہوگئی۔ فیروز کہنے لگا "تم احمق ہو۔ جاہل ہو۔ تمہارے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں"۔ اتفاق سے یہ باتیں اسلام صاحب نے بھی سُن لیں۔ جب وہ چھٹی جماعت میں دوسرے دن پڑھانے آئے تو سبق شروع کرنے سے پہلے انہوں نے لڑکوں سے کہا۔

"کل تمہارے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو جاہل اور احمق کہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بُرا بھلا کہا۔ تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ اگر تم دوسروں کی بے عزتی کرتے ہو تو اپنی ہی بے عزتی کرتے ہو۔

تعلیم اور شرافت کی ایک پہچان آدمی کی بات چیت ہوتی ہے۔ اِدھر تم نے زبان کھولی اور اُدھر پتہ چل گیا کہ تم کیسے ہو۔ اللہ میاں نے اپنی کتاب قرآن شریف میں ہمیں حکم دیا ہے کہ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ یعنی ہمیشہ ایسی زبان بولو جو تمہاری سوسائٹی میں شریفوں کی زبان مانی جاتی ہو۔

قرآن شریف نے ہمیں گفتگو اور بول چال کے بارے میں ایسی ہی دوسری اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ جیسے "ہمیشہ صاف، سچی اور سیدھی بات کرو"۔ "جھوٹی باتوں سے ہمیشہ بچو"۔ "ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرو"۔ "جب بھی بات کرو انصاف کی بات کرو"۔

اور ہاں، بعض بچے اونچی آواز میں

چیخ چیخ کر، چلا چلا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو آج دنیا میں کہیں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ گنوار لوگ چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ بہت پہلے قرآن شریف نے انسانوں کو بتایا تھا کہ۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ۔ یعنی اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔

اچھا میرے بیٹو! یہ تو ہوگئیں کچھ کام کی باتیں۔ اب اپنا سبق شروع کرو۔"

اسلام صاحب نے مُسکرا کر پڑھانا شروع ہی کیا تھا کہ فیروز اُٹھ کر کھڑا ہوگیا — اس نے کہا "جناب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔"

اسلام صاحب نے مُسکرا کر کہا "ضرور ضرور — کیا کہنا چاہتے ہو"۔ فیروز نے کہا "جناب! آپ نے آج جو کچھ کہا ہے میرے دل میں ایک ایک بات اُتر گئی ہے۔ آپ نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لئے میرا نام نہیں لیا۔ مگر کل میں نے ہی ارشاد کو بُرا بھلا کہا تھا — میں اپنے بھائی ارشاد سے آپ سب کے سامنے معافی چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ اب میری کسی بات سے میرے کسی بھائی کو دُکھ نہ پہنچے گا۔" یہ کہتے ہوئے فیروز کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اسلام صاحب نے آگے بڑھ کر فیروز کو لپٹا لیا اور اس سے کہا — "فیروز! تم بہت بہادر ہو — اپنی غلطی کو مان لینا سب سے بڑی بہادری ہے۔"

(بھائی جان)

★ ★ ★ ★ ★

AMERICAN EXPRESS

As soon as you step into an American Express Office you are among friends who pay you personal and friendly attention. The expert advice and guidance available at all of its over 400 offices throughout the world has led thousands to depend on American Express for their banking and travel arrangements.

AMERICAN EXPRESS

(Incorporated in the U.S.A with limited liability)

Karachi Lahore Rawalpindi